بسم اللہ الرحمن الرحیم

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجامی نگری انجمنے ساختہ اند

تذکرہ

فقیہ العصر قاضی القضاۃ

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

(سابق نائب امیر شریعت و قاضی القضاۃ امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ، سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، بانی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، بانی آل انڈیا ملی کونسل)

اختر امام عادل قاسمی

دائرۃ المعارف الربانیۃ

جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور بہار

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجامی نگری انجمنے ساختہ اند

تذکرہ

فقیہ العصر قاضی القضاۃ

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

(ولادت: ۲/ شعبان المعظم ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹/ اکتوبر ۱۹۳۶ء- وفات: ۲۰/ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ مطابق ۴/ اپریل ۲۰۱۰ء، مدفون مہدولی دربھنگہ بہار)

(حضرت قاضی صاحبؒ کی وفات پر مؤلف کے قلم سے لکھے گئے مضامین کا مجموعہ)

اختر امام عادل قاسمی

دائرۃ المعارف الربانیۃ

جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور بہار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب:- تذکرہ فقیہ العصر قاضی القضاۃ

(حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ)

مصنف:- مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی

صفحات:- ۷۴

سن اشاعت:- ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۰۲۳ء

ناشر:- دائرۃ المعارف الربانیۃ جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور بہار

قیمت: ۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے

☆مرکزی مکتبہ جامعہ ربانی منوروا شریف ،پوسٹ سوہما ، ضلع سمستی پور بہار 848207موبائل نمبر:9473136822

☆مکتبہ الامام ، سی 212 ،امام عادل منزل ، گراؤنڈ فلور ،شاہین باغ ،ابوالفضل پارٹ ۲، اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی25موبائل نمبر: 9934082422

فہرست مندرجات

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۱	”زبان خلق کو نقارۂ خدا کہیے“	۷
۲	بعض معاصرین کا اختلاف پھر اعتراف	۹
۳	زوال پذیر ہندستان میں علمی نشأۃ ثانیہ کا معمار	۱۰
۴	دور آخر کے فقیہ	۱۱
۵	عہد ساز شخصیت	۱۱
۶	باقاعدہ فقہی زندگی کا آغاز	۱۴
۷	بحیثیت قاضی شریعت	۱۵
۸	اسلامی عدالت—اردو زبان میں اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب	۱۷
۹	مباحث فقہیہ	۱۸
۱۰	رسالہ بحث و نظر- فقہی تحریک کا آغاز	۲۰
۱۱	اسلامک فقہ اکیڈمی- ہندوستان میں ایک نئے علمی انقلاب کا چشمہ	۲۱
۱۲	اجتماعی اور انفرادی اجتہاد میں فرق	۲۴
۱۳	یہ اصطلاحی اجتہاد نہیں ہے	۲۴
۱۴	اجتہاد کے تعلق سے قاضی صاحب کا نقطۂ نظر	۲۶
۱۵	اجتہاد کے عناصر ترکیبی	۲۶
۱۶	کوئی زمانہ مجتہد سے خالی ہو سکتا ہے یا نہیں؟	۲۷
۱۷	اجتہاد ایک نازک ترین ذمہ داری ہے	۲۹
۱۸	تجزئ اجتہاد کا مسئلہ-نقطۂ عدل	۳۰

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۱۹	فکری توازن اور مسلکی اعتدال	۳۱
۲۰	رخصت واباحت کی بحث میں نقطۂ اعتدال	۳۲
۲۱	مسئلہ تلفیق	۳۵
۲۲	اختلافی مسائل میں نقطۂ اتفاق	۳۷
۲۳	مصر کی مختلف تعریفات کا محل	۳۸
۲۴	قاضی صاحب خالص حنفی تھے	۴۱
۲۵	تفردات سے گریز	۴۳
۲۶	علمی رواداری کا ماحول	۴۶
۲۷	عصری حالات کی نباضی	۴۷
۲۸	دماغی موت وحیات کا مسئلہ	۴۸
۲۹	مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے	۵۳
۳۰	وہ گئے اور اپنا بدل چھوڑ کر نہیں گئے	۵۳
۳۱	معصوم بچپن کی محبت	۵۴
۳۲	میری علمی زندگی کے لئے ہلال عید	۵۵
۳۳	رسالہ بحث ونظر کا تعمیری کردار	۵۵
۳۴	اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) ایک عظیم علمی تحریک	۵۶
۳۵	اجتماعی اجتہاد	۵۷
۳۶	حضرت امام ابو حنیفہؒ کی اجتماعی فقہ	۵۸

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۳۷	جمود وانحطاط کا آغاز	۵۹
۳۸	قاضی صاحب کا انقلابی کارنامہ	۶۱
۳۹	تاریخ ساز فقہی سمیناروں کا آغاز	۶۱
۴۰	قاضی صاحبؒ سے پہلی ملاقات	۶۳
۴۱	قاضی صاحبؒ ایک مرد انقلاب تھے	۶۴
۴۲	قاضی صاحب کی ہمہ گیر اثر انگیزی	۶۵
۴۳	قاضی صاحب کے لئے بعض اکابر علماء کے اعترافات	۶۶
۴۴	قاضی صاحب نے علمی صحافت کا معیار بلند کیا	۶۹
۴۵	صنعتی انقلاب کی طرف توجہ	۷۰
۴۶	تحقیقی ذوق کی نشو ونما	۷۰
۴۷	عبقری شخصیت	۷۰
۴۸	فقیہ النفس عالم دین	۷۱
۴۹	میر کارواں چلا گیا	۷۲

حرف آغاز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمداللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدالمرسلین! امابعد

فقیہ العصر قاضی القضاۃ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ اس عہد کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے، آپ کی وفات حسرت آیات پر بے شمار تأثراتی وتعزیتی مضامین لکھے گئے، اس حقیر نے بھی مختلف مناسبتوں سے متعدد مضامین لکھے، اس رسالہ میں انہی مختلف مضامین کو جمع کر دیا گیا ہے، یہ تمام مضامین تأثراتی ہیں اور میرے اپنے جذبات واحساسات کے آئینہ دار ہیں، گو کہ ان سب کو ایک خاص لڑی میں پرونے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود قارئین کو اس میں مضامین کا کچھ تکرار محسوس ہوگا، اس کے لئے معذرت خواہ ہوں، گذارش ہے کہ انہیں ایک ایسے نیاز مند کا نذرانۂ عقیدت سمجھ کر ملاحظہ فرمالیں، جسے اپنے کلمات عقیدت بار بار دہرانے میں حظ محسوس ہوتا ہو، اللہ پاک حضرت قاضی صاحبؒ کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے اور ہمیں ان کے نقوش پا پر پورے اخلاص کے ساتھ چلنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین

اختر امام عادل قاسمی

مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور بہار

یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۴۵ھ مطابق ۱۶/ نومبر ۲۰۲۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

”زبان خلق کو نقارۂ خدا کہیے“

کہا جاتا ہے کہ ”زبان خلق کو نقارۂ خدا کہیے“، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات حسرت آیات پر جتنا کچھ لکھا گیا، زبان و قلم نے جس قدر آنسو بہائے، اہل دل اور اصحاب علم نے حسرت ویاس سے لبریز جملے استعمال کئے، جس کثرت سے مضامین لکھے گئے، جتنی بڑی تعداد میں تاثراتی جلسے، سیمینار اور سمپوزیم ہوئے، اور جس اہتمام سے رسالوں اور اخبارات نے خصوصی شمارے شائع کئے، اس کی مثال عصر حاضر کی وفیات میں کم ملتی ہے۔

اگر یہ زبان خلق خدا کی آواز تھی، تو قاضی صاحب بالیقین اس دور کے عظیم انسان تھے، قاضی صاحب اسلام کے ترجمان اور قانون اسلامی کے کامیاب وکیل تھے، اور اس میدان میں ان کی کوئی مثال نہیں تھی۔

بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جو زندگی میں نہیں کہی جاسکتیں، مصلحتیں رکاوٹ بنتی ہیں، مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے، تعلقات مانع بنتے ہیں، یا کسی کا پاس ولحاظ پیش نظر ہوتا ہے، لیکن مرنے کے بعد انسان اس کے تعلق سے ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہوجاتا ہے، اور اس کے بارے میں جو چاہے اظہار خیال کر سکتا ہے، اس لئے اصل احساس لوگوں کا کسی کے مرنے کے بعد سامنے آتا ہے، جو ایک سچا اور مخلصانہ احساس ہوتا ہے، اس میں کسی تصنع یا دباؤ کا دخل نہیں ہوتا۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے کہ زندگی میں امام صاحب پر بڑے مظالم ہوئے، طعن و تشنیع کے ایک پر ایک تیر چلائے گئے، طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے، یہاں تک کہ زندگی کے آخری لمحات جیل کی صعوبتوں میں گذرے، تشدد کی سنگینیوں سے دوچار ہونا پڑا، اور تاریخ میں کسی ایک شخص کا ذکر بھی نہیں ملتا، جس نے حکومت یا مخالفین کو ان حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی ہو اور کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ عوام یا خواص نے اس امام جلیل پر ہونے والے پر تشدد مظالم

کے خلاف کسی قسم کا احتجاج کیا ہو، جو کچھ بیتا، امام صاحب نے خود سہ لیا اور خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے، لیکن وفات ہوئی تو پورا بغداد امڈ کر چلا آیا، کوئی آنکھ نہیں تھی جو اشکبار نہ ہو، پورا بغداد ماتم کدہ بن گیا ، خلیفۂ وقت بھی افسوس کئے بغیر نہ رہ سکا، اس وقت کے بڑے بڑے علماء وفقہاء نے امام صاحبؒ کے بارے میں خیر کے کلمات کہے، اور ان کی وفات پر اپنے بے پناہ رنج و غم کا اظہار کیا۔

قاضی صاحبؒ کے ساتھ بھی یہی ہوا ان کی زندگی میں بڑے متضاد خیالات اور افواہیں پھیلتی رہیں اور جھوٹی سچی خبریں شائع ہوتی رہیں، یہ مرد مجاہد مسلسل پانچ (۵) سال تک خطرناک امراض کے شکنجوں میں تڑپتا رہا، اور اس کے باوجود اس مرد بیمار کو لوگوں نے معاف نہیں کیا، لیکن ان کی وفات کے بعد جیسے دنیا ہی بدل گئی، ایک عجیب حسرت و یاس فضا پر چھا گئی، تمام بولنے والی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں، مخالفتوں کا شور تھم گیا اور حق اور حقیقت کے پرستاروں نے بڑے انصاف کے ساتھ قاضی صاحبؒ کے لئے کلمات خیر کہے، ان کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کیا اور ان کی وفات کو اس دور میں امت مسلمہ کا عظیم ترین سانحہ قرار دیا۔

وہ جس کی زبان سے نکلی ہوئی آواز کچھ لوگوں پر سب سے زیادہ گراں گذرتی تھی، جس کے منہ کا ہر بول زبان خنجر معلوم ہوتا تھا، ۵/ اپریل ۲۰۰۲ء کی صبح دہلی کے اسپتال میں سفید کفن میں لپٹا ہوا رکھا تھا اور زبان حال سے اپنے کرم فرماؤں سے کہہ رہا تھا: (شاعر کی روح سے تھوڑی ترمیم کی معذرت کے ساتھ)

سنے جاتے نہ تھے تم سے میرے دن رات کے قصے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

لیکن اس کفن کے سفید صفحات پر اس عہد کی سب سے حیرت انگیز تاریخ لکھی جارہی تھی، دوست اور دشمن سب رو رہے تھے، سب اس کی وفات پر ماتم کناں تھے، کیا موافق اور کیا مخالف، سب کو گویا اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، سب کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور سب پر یہ منکشف ہو گیا تھا کہ یہ وہ نہیں

جو ہم نے سمجھا تھا، بلکہ یہ اس دور کا عظیم انسان تھا، اور اس کے جانے سے اس دور کی عظمت کا ایک باب ٹوٹ گیا ہے۔

بعض معاصرین کا اختلاف پھر اعتراف

حضرت قاضی صاحبؒ کی وفات کے بعد کوئی ایک معتبر مضمون بھی مجھے نہیں ملا، جو قاضی صاحب کی مخالفت میں لکھا گیا ہو، مجنون کی بڑ کا اعتبار نہیں۔۔۔۔ کئی معاصر علماء نے قاضی صاحبؒ سے اختلاف کیا، خواہ اس اختلاف کا مقصد کچھ رہا ہو، اور اس کی جو بھی بنیاد ہو، لیکن یہ اختلاف خود قاضی صاحبؒ کے اپنے علمی سفر میں کافی معاون ثابت ہوتا تھا اور میں نے بارہا محسوس کیا کہ وہ کوئی بھی نظریہ انتہائی احتیاط کے ساتھ مکمل علمی دلائل کی روشنی میں قائم فرماتے تھے اور اس باب میں وہ بالکل مخلص تھے، دلائل سے اختلاف بہتوں کو ہو سکتا تھا اور ہوتا تھا، مگر دلائل کی قوت اور قاضی صاحبؒ کے اخلاص کا انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت قاضی صاحبؒ کی وفات کے بعد ان بزرگوں کو احساس ہوا کہ بعض علمی اختلافات کے باوجود قاضی صاحب بہر حال ایک عظیم اور اس دور کے منفرد انسان تھے، چنانچہ انہوں نے کھل کر قاضی صاحب کی خدمات و کمالات کا اعتراف کیا اور اپنے اختلافات کو فراموش کر دیا، یہ ان بزرگوں کے اخلاص کی دلیل ہے، اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا اختلاف علم و اخلاص پر مبنی تھا، نہ کہ کسی حمیت و عصبیت یا تنگ نظری پر۔[1]

---

[1] – تحریر بہ مقام دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد، بتاریخ ۱۳/ جولائی ۲۰۰۲ء

زوال پذیر ہندستان میں علمی نشأۃ ثانیہ کا معمار

ہندستان ہر زمانے میں علم و فن کا گہوارہ رہا ہے اور تاریخ کے ہر دور میں ممتاز علماء وفقہاء یہاں موجود رہے ہیں، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی مشہور کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت" میں، حضرت مولانا عبد الحئ لکھنویؒ نے "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" اور "نزہۃ الخواطر" میں اور حضرت مولانا سید میاں صاحبؒ سابق ناظم جمعیت علماء ہند نے "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں ہندوستان کی علمی تاریخ کا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے،فجزاء هم الله عنا احسن الجزاء

البتہ ہندوستان پر غیر اسلامی تسلط کے بعد یہاں کا نظام تعلیم کافی حد تک متأثر ہوا اور ہر میدان کی طرح مسلمان اس میدان میں بھی زوال سے دوچار ہوئے، اس دور میں دار العلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور اس طرح کے چند مرکزی اداروں نے ہندوستان کی علمی تاریخ کو سنبھالا دینے میں بڑا کردار ادا کیا، ان اداروں نے بڑے بڑے علماء پیدا کئے اور ہندوستان کے علمی خلا کو پر کرنے کی کوشش کی۔

ان میں دار العلوم دیوبند کی علمی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، بالخصوص اس نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے طرز پر قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کے لئے جو بے مثال خدمات انجام دی ہیں، ان کے اثرات پوری علمی دنیا پر پڑے، اکابر دیوبند نے خصوصیت کے ساتھ علم وعقیدہ سے انحراف کے اس دور میں فقہ اور قانون اسلامی پر توجہ دی، اور موجودہ تغیرات وانقلابات کے تناظر میں اسلامی اصول وکلیات کی تطبیق کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، اس طبقہ میں فقیہ الامت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حکیم الامتؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مفکر اسلام حضرت علامہ و مولانا سید ابو المحاسن سجادؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب مفتی اول دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ، حضرت علامہ ظفر احمد تھانویؒ اور حضرت مولانا عبد الصمد رحمانیؒ وغیرہ کے نام بہت زیادہ نمایاں ہیں۔

دور آخر کے فقیہ

اور اس آخری دور میں فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ کو جماعت دیوبند میں بحیثیت فقیہ جو شہرت وامتیاز حاصل ہوا ہے وہ اس دور کے کسی عالم کے حصہ میں نہیں آیا۔

قاضی صاحب اس دور کی عظیم ترین فقہی شخصیت تھے، فقہ اسلامی اور بین الاقوامی قوانین کی باریکیوں پر ان کی بڑی گہری نگاہ تھی، اور اس باب میں اصولی ذہن ودماغ کے مالک تھے، وہ بہت تیزی کے ساتھ مسائل وواقعات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے، ان کا مطالعہ بہت وسیع، فکر رسا، نگاہ دوررس، اور طبیعت حد درجہ حساس تھی، نئے مسائل وواقعات کی فقہی تطبیق کا ان کو خداداد ملکہ تھا، وہ کھلی آنکھوں اور کھلے ذہن ودماغ کے ساتھ حالات وواقعات کا مطالعہ کرتے تھے، حالات کو صحیح طور پر سمجھتے تھے اور ان کی صحیح اسلامی تطبیق پیش فرماتے تھے، مشکل سے مشکل مسائل کی ایسی ترجمانی فرماتے تھے، اور ان کے اہم ترین نکتوں کو ایسے آسان پیرائے میں بیان کرتے کہ رشک جہاں بن جاتے، علمی وفقہی الجھنوں کو اس طرح چٹکیوں میں حل کرتے جیسے کہ یہ کوئی الجھن ہی نہ ہو، اور فقہی آراء ونظریات اور علمی مسائل ومباحث کا ایسا تجزیہ فرماتے کہ قول فیصل ثابت ہوتا، ان سے گفتگو کرتے ہوئے یا ان کی گفتگو سنتے ہوئے قدم قدم پر اپنی جہالت وبے خبری کا احساس ہوتا تھا، میں نے فقہ اسلامی کا ایسا شناور اور قانون اسلامی کا ایسا مزاج داں نہیں دیکھا۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

عہد ساز شخصیت

قاضی صاحب جس عظیم فقہی صلاحیت اور جامعیت کے مالک تھے اور مطالعہ ومعلومات کا جو بحر بیکراں ان کے سینے میں موجزن تھا افسوس وہ ان کے سینے سے سفینہ میں منتقل نہ ہوسکا، فقہی مجلات،

کتابوں اور رسائل کی شکل میں آج جو کچھ محفوظ ہے، وہ ان کے اصل علم کا عشر عشیر بھی نہیں ہے، جیسے کہ حضرت علامہ کشمیریؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے علم کا بہت تھوڑا حصہ ان کے تلامذہ اور افادات کے ذریعہ سامنے آسکا، ورنہ علامہ کی شخصیت جس عظیم تر علم اور فن سے عبارت تھی، ان کا موجودہ علمی ذخیرہ اس کا سواں حصہ بھی نہیں ہے، اس کا پورا اندازہ ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جنہوں نے خود اس شخصیت کو علمی طور پر برتا ہو اور مختلف مسائل و معاملات میں اس کا تجربہ کیا ہو، صرف کتابوں اور علمی افادات کے ذریعہ شخصیت کو جاننے والے لوگ کسی بھی عظیم شخصیت کی حقیقی عظمت کا پورا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

دنیا میں بہت سے ایسے عظیم لوگ ہوئے ہیں جن کو ان کی قلمی تصنیفات و تالیفات سے زیادہ انسانی تصنیفات و تالیفات اور ان کے تیار کردہ مردان کار کے ذریعہ جانا گیا، اس قسم کی عظیم ہستیوں میں امام اعظم ابو حنیفہؒ کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں ہے، امام صاحب کی طرف جو تصنیفات منسوب ہیں، ان کو دیکھ کر اگر کوئی شخص امام صاحب کے علمی مقام کا اندازہ کرنا چاہے تو اسے سخت مایوسی ہو گی، لیکن انہوں نے افراد کار، علمی ماحول اور فقہی تحریک کی شکل میں جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، اس کی کوئی مثال پوری تاریخ اسلامی میں نہیں ملتی، اس قسم کی عظیم ہستیاں پورے عہد اور تاریخ کو جنم دیتی ہے، صرف کتاب اور قلم ان کی جد وجہد کا موضوع نہیں رہتے، وہ پوری تاریخ تیار کرتے ہیں، اور ایک عہد اور ایک تاریخ کے لئے جن بنیادی عناصر کی ضرورت ہوتی ہے ان کی تشکیل و تکمیل کرتے ہیں، کتاب اور قلم تاریخ کا صرف ایک عنصر ہے، مکمل تاریخ نہیں، اس لئے ان شخصیتوں کو پوری طرح جاننے کے لئے ان کے پورے عہد کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس عہد کے ہر مرحلہ پر اس شخصیت کے اثرات کا سراغ لگانا چاہیئے ، عام طور پر اس قسم کے بزرگان دین تاریخ کے پس منظر میں رہ کر سارے کام انجام دیتے ہیں اور ان کی زندگی میں بہت سے لوگوں کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ زندگی، توانائی اور چہل پہل کس کی بدولت ہے؟ لیکن ان کے گذرنے کے بعد تاریخ کی گاڑی جب اچانک رکنے لگتی ہے، تو عام طور پر پتہ چلتا ہے کہ تاریخ ساز کون تھا؟ اور اس تاریخ کے پیچھے کس کی شخصیت کارفرما تھی؟

ہمارے اکابر دیوبند میں اس عبقری شان کی چند شخصیتیں بہت زیادہ نمایاں گذری ہیں، حضرت

الامام الکبیر، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم النانوتوی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ یہ شخصیتیں اپنے اپنے دور میں علوم وفنون اور اسرار ومعارف میں امامت کا درجہ رکھتی تھیں، اور اس دور میں پورے عالم اسلام میں ان کی کوئی نظیر موجود نہیں تھی، لیکن ان کی عظمت اور جلالت شان کا اندازہ ان کے تیار کردہ افراد کار اور ایک عہد اور تاریخ کی تشکیل وتعمیر کے مطالعہ سے ہوتا ہے، ان حضرات کی کتابوں، تقاریر، مکاتیب اور افادات کا جو حصہ آج ہمارے کتب خانوں میں موجود ہے وہ ان کے علوم کا بہت ہی تھوڑا حصہ ہے، اسی لئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے حضرت نانوتویؒ کی تدفین کے وقت بڑی حسرت ویاس کے ساتھ فرمایا تھا:

مٹی میں کیا سمجھ کے دباتے ہو دوستوں
گنجینۂ علوم ہے یہ، گنج زر نہیں

ہمارے وقت کی شخصیات میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی شخصیت بھی انہی بزرگوں کی صف میں شمار کئے جانے کے لائق ہے، ہمارے پاس ان کے چھوڑے ہوئے علمی وفقہی ذخائر کی مقدار ان کی فقہی عظمت سے کوئی نسبت نہیں رکھتی، وہ جس زبردست ملکۂ فقہی (جس کو علامہ کشمیریؒ کی اصطلاح میں "فقہ النفس" سے تعبیر کرسکتے ہیں) اور وسیع علم ومطالعہ کے مالک تھے، اس کا اندازہ ان کی صحبتوں اور مجلسوں سے ہوتا تھا، انہوں نے تصنیف وتالیف پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، بڑی مشکل سے چند کتابیں اور مقالات تحریر فرمائے، اگر وہ تصنیف وتالیف پر توجہ دیتے تو فقہی ذخیرے میں قابل قدر اضافہ ہوتا مگر وہ صرف مصنف اور قلمکار نہیں تھے، وہ ایک عہد ساز انسان تھے، انہوں نے ایک عہد کو جنم دیا، مصنفین پیدا کئے، ایک نئی نسل کی تشکیل کی، پورے طبقۂ علماء کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ذہنی اور علمی تربیت فرمائی، انہوں نے ایک شعور دیا، بیداری بخشی، غافلوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا، راحت پسندوں کو

نیند سے اٹھا کر کام میں لگایا، طلبگاروں کی تسکین کا سامان فراہم کیا، وہ ایک عظیم انسان تھے، وہ اس دور میں استاذ العلماء اور سید الفقہاء تھے، اور علمی و فقہی خدمات کے لحاظ سے اس دور کے منفرد اور یکتائے روزگار انسان تھے،فرحمہ اللہ وجزاہ اللہ عنا احسن الجزاء

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

قاضی صاحبؒ کی فقہی شخصیت اور اس میدان میں ان کی امتیازی شان کا پتہ لگانے کے لئے ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کا مطالعہ کرنا ہوگا:

باقاعدہ فقہی زندگی کا آغاز

قاضی صاحب دار العلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد جامعہ رحمانی مونگیر میں استاذ ہوئے، اس وقت ان کے تصور میں بھی نہ ہوگا کہ اللہ ان سے فقہ کے میدان میں اتنا بڑا کام لے گا، امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ بڑے دیدہ ور، جوہر شناس اور مردم ساز انسان تھے، ان کی دور رس نگاہ نے قاضی صاحب کے اندر چھپے ہوئے جوہر کو دیکھ لیا، اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ جیسے عظیم الشان اور تاریخی ادارہ کے قاضی شریعت جیسا ذمہ دارانہ منصب ان کو تفویض فرمایا، یہ قاضی صاحبؒ کی فقہ وقضاء کی طرف پہلی پیش رفت تھی، قاضی صاحبؒ نے خود تحریر فرمایا ہے:

"حضرت امیر شریعت مدظلہ نے جب اس حقیر کو دار القضاء کی ذمہ داری سونپی اور ۶/ شوال ۱۳۸۱ھ کو اس حقیر نے اس منصب کا چارج لیا تو کار قضا کی انجام دہی بہت مشکل نظر آئی میرا اس سلسلے میں کل سرمایہ تھا کہ ۸۰-۱۳۸۱ھ میں نے جامعہ رحمانی کے استاذ کی حیثیت سے ہدایہ آخرین محنت سے پڑھائی اور فتح القدیر کا مطالعہ کیا ۔۔۔ الحاج محمد شفیع صاحب مرحوم سردفتر دار القضاء کبھی کبھی امور قضاء کے بارے میں استفتاء بھیجتے تو اس کا جواب لکھتا، اس سلسلے میں قضاء علی الغائب کے مسئلے پر میرا

ایک مقالہ رسالہ دار العلوم دیوبند میں شائع ہوا، بعض مقدمات کی سماعت بھی میرے پاس بھیج دی جاتی، لیکن جب اس عظیم الشان ذمہ داری کا بوجھ اس دوش ناتواں پر پڑا تو معلوم ہوا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے[2]

بحیثیت قاضی شریعت

قاضی صاحبؒ سے پیشتر امارت شرعیہ میں کئی بالغ نظر اور اصحاب علم و تحقیق قاضیوں نے اپنی خدمات پیش کی تھیں ان کا دور بھی امارت کے عہد آغاز کے لحاظ سے انتہائی تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور ان حضرات نے جو خطوط تیار کئے اور جو بنیادیں فراہم کیں وہ بعد میں آنے والے قاضیوں کے لئے دلیل راہ ثابت ہوئیں، لیکن حضرت قاضی صاحبؒ کا عہد خدمات اور نظام قضاء کی توسیع وانضباط کے لحاظ سے امارت کی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن باب ہے، قاضی صاحب بحیثیت فقیہ اس دار القضاء سے متعارف ہوئے اور ان کے فیصلوں کی علمی وفنی اہمیت کا اندازہ ہوا، بڑے مشکل مقدمات کے فیصلے فرمائے، جس کی شہرت ملک کے طول وعرض میں سنی گئی، بھٹکل (کرناٹک) کے مولانا فاروق ندوی صاحب ایک اچھے عالم دین اور داعی الی اللہ ہیں آج کل دوبئی میں رہتے ہیں، کئی سال قبل ایک بار حیدرآباد تشریف لائے تو میرے پاس بھی کافی وقت دیا، ان کے ساتھ کئی اچھی علمی نشستیں رہیں، ایک نشست میں حضرت قاضی صاحبؒ کے ذکر خیر پر انہوں نے فرمایا کہ جس زمانہ میں میں ندوہ کا طالب علم تھا، اور ندوہ میں کلیۃ الشریعہ اور دار القضاء غالباً نیا نیا قائم ہوا تھا، وہاں ایک ایسا پیچیدہ مقدمہ پیش ہوا جس کا فیصلہ مقامی قضاۃ ایک ماہ کی مسلسل بحث وتمحیص کے بعد بھی نہ کرسکے، مدعی کے بیان میں کوئی سقم تھا، یا گواہوں کے بیان پر پوری طرح جرح نہیں ہورہی تھی، اور اصل واقعہ سامنے نہیں آپارہا تھا، بالآخر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خواہش پر امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی نے حضرت قاضی صاحبؒ کو اس مقدمہ کی سماعت کے لئے لکھنؤ روانہ فرمایا، قاضی صاحب تشریف لائے اور لکھنؤ کے اس اہم ترین پیچیدہ مقدمہ کا دو تین روز کی

---

[2] – اسلامی عدالت مقدمہ ص ۱۳۰ مؤلفہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، شائع کردہ قاضی پبلیشر دہلی

سماعتوں کے بعد تاریخی فیصلہ سنایا، جو ندوہ کی تاریخ دار القضاء میں ہمیشہ یادگار رہے گا انشاء اللہ۔

قاضی صاحبؒ نے کلکتہ ہائی کورٹ میں غالباً نفقۂ مطلقہ کے مسئلے پر جو قانونی تقریر کی تھی وہ بھی قاضی صاحبؒ کی فقہی اور قانونی صلاحیت کی آئینہ دار ہے۔

قاضی صاحبؒ نے امارت شرعیہ کے دار القضاء سے ایک طویل عرصے تک اہم ترین فیصلے فرمائے جن کا کچھ حصہ بعد میں مجلہ بحث و نظر میں شائع ہوا، ان سے قاضی صاحبؒ کی بصیرت فقہی اور جلالت علمی کا اندازہ ہوتا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے اس زوال پذیر دور میں کوئی ایسا بالغ نظر فقیہ اور صاحب اجتہاد قاضی بھی پیدا ہوگا بظاہر حالات کسی نے سوچا بھی نہ تھا، لیکن قاضی صاحبؒ کے تفقہ اور قانونی و قضائی صلاحیت نے اس دور میں عہد اول کے قاضی شریحؒ کی یاد تازہ کر دی۔

علمی طور پر قاضی صاحبؒ نے امارت کے نظام قضاء کو مستحکم اور بااصول بنایا، اپنے فیصلوں سے ایک نیا رخ اور نئی زندگی دی، اور عملی طور پر اس کو ایک زندہ اور متحرک ادارہ بنایا، بہار واڑیسہ کے گوشے گوشے میں دار القضاء قائم کئے، اور مسلمانوں کو دار القضاء کی طرف متوجہ کیا اور ان سے فرمایا کہ اپنی زندگی کے مسائل لیکر کافروں کے پاس نہ جاؤ، ان کی عدالت سے انصاف کی بھیک نہ مانگو، وہاں تمہیں سب کچھ مل سکتا ہے مگر خدائی انصاف نہیں مل سکتا، اپنے مسائل کے حل کے لئے اپنے علماء سے رجوع کرو اور اس غیر اسلامی ہندوستان میں اپنے مسلمان ہونے کا مظاہرہ کرو۔

قاضی صاحب نے مسلم پرسنل لاء کے پلیٹ فارم سے بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دارالقضاء کی مہم چلائی، اور اس طرح ان کی کوششوں سے ہندوستان کے کئی بڑے شہروں میں دار القضاء قائم ہوئے، اور مسلم پرسنل لاء کی نگرانی میں وہاں قاضیوں کا تقرر عمل میں آیا۔

قاضی صاحب نے اس سلسلے میں کئی رہنما خطوط تیار کئے، ایک طرف ان کے لئے تربیت قضاء کا باقاعدہ ایک نصاب مرتب کیا اور عملی طور پر خود اپنی نگرانی میں ان کی تربیت کا کام شروع فرمایا جس میں امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی مکمل سرپرستی آپ کو حاصل رہی۔

اسلامی عدالت—اردو زبان میں اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب

دوسری طرف قاضی صاحب نے اسلام کے عدالتی نظام پر دفعہ وار جدید رنگ وآہنگ میں اردو زبان میں ایک باقاعدہ کتاب لکھنے کا کام شروع فرمایا(جو شاید قاضی صاحبؒ کی پہلی تصنیفی کوشش تھی)جو دراصل ان کے دو پیشرو بزرگ حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحبؒ اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی آرزوؤں کی تکمیل تھی، قاضی صاحبؒ نے یہ کام بڑے اہتمام کے ساتھ شروع فرمایا، اس راہ میں ان کو کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، بعض شدید قسم کے ہمت شکن واقعات پیش آئے، مگر اس مرد مجاہد نے ہمت نہیں ہاری، اور کام جاری رکھا، مگر افسوس کہ قاضی صاحب اپنی بعض بڑی مصروفیات کے سبب اس اہم ترین کام کو پایۂ تکمیل تک نہ پہونچا سکے، اس کا صرف ایک جزو" اسلام کا عدالتی نظام" تیار ہو سکا، جو "اسلامی عدالت" کے نام سے قاضی پبلشرز دہلی سے شائع ہوا، اور حضرت امیر شریعت رابعؒ نے اس کی رسم اجراء انجام دی، اصول دعویٰ، اصول شہادت اور اصول اقرار جیسے اہم ترین ابواب پر ان کا کام تشنۂ تکمیل رہا، سننے میں آیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب وہ زیادہ تر سفر سے معذور ہو گئے، اس کام کی تکمیل پر توجہ دی تھی اور کسی حد تک کام کو آگے بڑھایا تھا، اللہ کرے کہ قاضی صاحبؒ کا یہ علمی اثاثہ بھی سامنے آئے اور اس سے استفادہ کی شکل عام ہو، آمین۔(مگر قاضی صاحبؒ کے وصال کو بیس اکیس سال ہو گئے اب تک کوئی چیز سامنے نہ آسکی)

مگر "اسلامی عدالت" کا جو پہلا حصہ ہمارے پاس ہے،وہ بھی کوئی کم غنیمت نہیں ہے، اپنے موضوع پر اردو زبان میں پہلی کتاب ہے، جس میں اسلام میں قضاء کی اہمیت، قضاۃ کی اہلیت، شرائط انتخاب، عدالتی کاروائی، طریق کار، قضاء علی الغائب، اور کتاب القاضی الی القاضی جیسے اہم ترین عنوانات کے تحت دفعہ وار مسائل دیئے گئے ہیں، یہ کتاب ایک طرف اسلام کے عدالتی قوانین کا معتبر ترین مجموعہ ہے، تو دوسری طرف اسلامی قاضیوں کے لئے دلیل راہ بھی ہے، اللہ قاضی صاحبؒ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، بڑا اہم کام کر گئے، اللہ اس کام کو ان کے لئے سرمایۂ آخرت اور صدقۂ جاریہ بنائے آمین۔

مباحث فقہیہ (فقہی تحریرات کا مجموعہ)

یہیں پر قاضی صاحبؒ کی ایک اہم ترین کتاب "مباحث فقہیہ "کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہے جو ان کی زندگی کی آخری کتاب ہے جو آپ کے سامنے چھپ کر آسکی، جس پر پیش لفظ حضرت قاضی صاحبؒ نے اپنی شدید بیماری کی حالت میں (جو مرض الوفات ہی کا ایک حصہ تھا) وفات سے قریب دوماہ پیشتر تحریر فرمایا، اور معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ جب یہ کتاب چھپ کر آئی، اس وقت قاضی صاحبؒ پر بیہوشی کی کیفیت رہنے لگی تھی، قاضی صاحب کو جب تیمارداروں نے بتایا کہ آپ کی کتاب چھپ کر آگئی ہے، تو انہوں نے اپنی شدید تکلیف کی حالت میں اس کتاب کو طلب فرمایا اور اس پر ہاتھ پھیرا۔

یہ کتاب جیسا کہ خود حضرت قاضی صاحبؒ نے اپنے پیش لفظ میں تحریر فرمایا ہے:

"اس میں میری پرانی تحریروں، اصول فقہ سے متعلق، اوقاف وعبادات سے متعلق، عائلی زندگی کے شرعی قوانین، اسلام کے عدالتی نظام، طبی مباحث، معاشی مسائل اس طرح کے مقالات کو اور دیگر مباحث کو جمع کر دیا گیا ہے جو ان شاء اللہ مفید ہو گا، یہ مقالات ومباحث پرانے ہیں، بعض دفعہ کسی شخص کی فکر بھی بدلتی ہے"[3]

اس مجموعہ کو حضرت قاضی صاحبؒ کی علالت کے ایام میں فقہ اکیڈمی کے بعض ارکان بالخصوص جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہ (جو حضرت قاضی صاحبؒ کے خاص بھتیجے اور قابل فخر شاگرد بھی ہیں) نے مرتب فرمایا ہے، جس کا تذکرہ خود قاضی صاحب نے بھی اپنے پیش لفظ میں فرمایا ہے:

"مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور فقہ اکیڈمی کے کارکنوں نے جس طرح بے حد محنت کے ساتھ ایک ایک پرزہ اکٹھا کر کے ایک پورے مکان کی تعمیر کر ڈالی، اس

---

[3] - مباحث فقہیہ ص ۷

کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں"[4]

مجموعہ کی ترتیب میں بنیادی طور پر جس بات کالحاظ رکھا گیاہے،وہ مولاناخالد سیف اللہ رحمانی کے الفاظ میں یہ ہے:

"یہ مجموعہ جو آپ کے سامنے ہے،(حضرت)مصنف کی فقہی تحریروں پر مشتمل ہے،اس میں دومرکزی عنوانات کے تحت مقالات جمع کئے گئے ہیں:

ا-اسلام کے اصول قانون سے متعلق مضامین،اس میں بعض مضامین نئے ہیں،جو سہ ماہی "بحث و نظر" میں طبع ہوئے ہیں،کچھ وہ اصولی مباحث ہیں جو اسلامی عدالت میں مقدمہ کے ایک حصہ کی حیثیت سے شریک ہیں۔

۲-فقہی موضوعات پر آپ کی تحریریں جن میں بعض پیچیدہ سوالات کو حل کیا گیاہے یاان سوالات کو ابھارا گیاہے،ان میں عبادات سے متعلق مسائل بھی ہیں ،جدید معاشی نظام نے جو مسائل پیدا کئے ہیں،ان میں سے کچھ اہم مسائل پر گفتگو کی گئی ہے،لیکن زیادہ تر مقالات سماجی اور معاشرتی مسائل سے متعلق ہیں،خاص کر وہ مسائل جو ہندستان کے مخصوص ماحول میں علماء کے غوروفکر کے متقاضی ہیں ، حضرت قاضی صاحبؒ نے وقتاًفوقتاًاہم استفتاء کے جوابات بھی دیئے ہیں،جو عام طور پر محفوظ نہیں رہے،تاہم بعض فتاویٰ بحث و نظر میں طباعت کی وجہ سے محفوظ ہیں،یہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں،اس مجموعہ میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جن کو راقم الحروف نے ۱۹۸۵ء میں "چند اہم فقہی مسائل بدلتے ہوئے حالات میں" کے عنوان سے شائع کیا تھا"[5]

یہ مجموعہ قانون اسلامی کے انتہائی اہم،حساس اورزندہ مسائل سے بحث کرتا ہے،اور مرتبین

---

[4] -مباحث فقہیہ ص ۷

[5] -مباحث فقہیہ ص ۲۳

قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے عصر حاضر کی رعایت کرتے ہوئے قاضی صاحب کے فقہی مقالات کو جمع کیا، جن سے ایک طرف بہت سے اہم مسائل پر فکر و نظر اور بصیرت کے دریچے کھلتے ہیں، دوسری طرف قاضی صاحب کی فقہی بصیرت و جامعیت اوران کی فقہی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے، اس کو پڑھ کر قاضی صاحب کے مسلک و مشرب، اختلافی مسائل میں ان کے طرز عمل اوران کے فقہی نظریات پر روشنی پڑتی ہے، جس سے قاضی صاحب کی فقہی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔

رسالہ بحث و نظر - فقہی تحریک کا آغاز

قاضی صاحبؒ کا دوسرا بڑا کارنامہ رسالہ بحث و نظر کی صورت میں سامنے آیا، بلکہ میرے نزدیک قاضی صاحبؒ کی اصل فقہی تحریک کا نقطۂ آغاز یہی رسالہ ہے، اگرچیکہ قاضی صاحبؒ نے اس سے قبل بعض اہم فقہی موضوعات پر مقالے لکھے تھے، جو رسالہ دار العلوم دیوبند اور ملک کے بعض رسائل میں شائع ہوئے، لیکن ان کی افادیت بہت محدود تھی، علاوہ ازیں ان میں تحریکی شان موجود نہیں تھی، رسالہ "بحث و نظر" پہلی بار قاضی صاحب کی فقہی تحقیقات وافکار کا ترجمان بن کر سامنے آیا اور اس رسالہ کے صفحات پر قاضی صاحبؒ کے بڑے اہم مقالات، فتاویٰ اور فیصلے شائع ہوئے ۔۔۔ نیز اسی رسالہ کے ذریعہ قاضی صاحبؒ نے ایک عہد اور ایک نسل کی تعلیم وتربیت اور فکری تشکیل کا آغاز کیا، انہوں نے علماء اور طلبہ کے دلوں میں طلب و جستجو کی آگ بھڑکادی، ان کو ایک سمت سفر دیا، علم و تحقیق کا سلیقہ دیا، بہت سی وہ کتابیں جن کے نام سے بھی طلبہ وفضلاء واقف نہیں تھے یا تو وہ کتابیں میسر نہیں تھیں یا بڑی لائبریریوں کے نمائش خانوں میں محفوظ تھیں، کئی دہائیوں سے کسی نے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا، قاضی صاحبؒ نے ان کتابوں پر سے جمی گرد کو صاف کیا ان کے نام اور مقام سے علماء کو واقف کرایا، اور محنت و مطالعہ سے بھاگنے والی جماعت کو کتابوں سے قریب کیا۔

اسلامک فقہ اکیڈمی- ہندوستان میں ایک نئے علمی انقلاب کا چشمہ

قاضی صاحبؒ کا سب سے اہم اور عظیم الشان فقہی کارنامہ "اسلامک فقہ اکیڈمی" کا قیام ہے، عرصہ سے ملت کو اس قسم کے زندہ اور متحرک ادارہ کی سخت ضرورت تھی، علماء کئی دہائیوں سے علمی جمود کا شکار ہو چکے تھے، تحقیقی مطالعہ کا ذوق گھٹتا جارہا تھا، چند افراد تھے جن کے دم سے تحقیق و مطالعہ کی بزم قائم تھی، ورنہ یہ بزم بالکل سونی پڑچکی تھی، علمی ترقیات، اور توسیعی مطالعات کا سلسلہ تقریباً مفقود ہو گیا تھا، جبکہ دور جدید کے بدلتے ہوئے حالات میں علماء وفقہاء کو کافی بیدار رہنے کی ضرورت تھی، عصر جدید میں کئی ایسے مسائل پیدا ہو چکے تھے جن پر اجتماعی غور وفکر کی حاجت تھی، دنیا کو ان کے حل کا انتظار تھا، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج افراد میں اجتہادی صلاحیت کی کمی کی بنا پر انفرادی آراء پر اعتماد کرنا مشکل ترین امر تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی شخص اٹھے اور علماء کو اجتماعی بحث و تحقیق اور شورائی اجتہاد پر جمع کرے، یہ کام انتہائی مشکل اور صبر آزما تھا، اور اس کے لئے فی زمانہ حضرت قاضی صاحبؒ سے زیادہ موزوں کوئی شخصیت نہیں تھی، اللہ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی، انہوں نے وقت کی پکار اور حالات کے تقاضوں کو سمجھا اور اس عظیم الشان مجلس فقہی کی بنیاد ڈالی، جو آزادی کے بعد ہندوستان کی سب سے بڑی علمی اور انقلابی تحریک ثابت ہوئی۔

قاضی صاحب نے ہندوستان میں اجتماعی اجتہاد کی بنیاد ڈال کر اسلام کی قدیم علمی و فقہی تاریخ کا احیاء فرمایا جو عرصہ سے ہندوستان سے ناپید ہو چکی تھی، ہندوستان کا طویل اسلامی دور بھی اس میدان میں کسی بڑی اجتماعی کوشش کے ذکر سے خالی ہے، علامہ شامیؒ نے بیرون ہند اس قسم کی بعض اجتماعی کوششوں کا تذکرہ کیا ہے، مثلاً بیع الوفاء کی بحث کے ضمن میں علامہ شامیؒ نے فتاویٰ خیریہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ پانچویں صدی ہجری میں جب بخارا اور اس کے مضافات میں بیع الوفاء کا رواج ہوا تو امام حسن ماتریدیؒ کو اس زمانے کے ایک مشہور عالم نے اجتماعی غور وفکر کا مشورہ دیا تھا، اگرچہ امام ماتریدیؒ نے یہ کہہ کر خود اپنی شرکت سے معذرت کر دی تھی، کہ میں اس سلسلے میں اپنی رائے ظاہر کر چکا ہوں اور تمام لوگوں کو میری رائے کا علم بھی ہو چکا ہے، اب آپ لوگ چاہتے ہیں تو علماء جمع ہوں اور اس پر غور کریں، میری رائے اگر

ان کے خلاف پڑے تو دلائل سے ثابت کریں کہ میری رائے غلط کیوں ہے؟[6]

مگر خود ہندوستان میں اس قسم کی کوئی بڑی کوشش نہیں ہوئی، فقہ حنفی کے مسائل وجزئیات کی ترتیب وتدوین کے لئے تو کئی بار ایسی مجلسیں یہاں قائم ہوئیں، اور ان مجالس فقہیہ نے بعض اہم قانونی مجموعے تیار کئے، مثلاً عہد تاتار خان میں فتاویٰ تاتار خانیہ کی اور عہد عالمگیری میں فتاویٰ ہندیہ کی ترتیب عمل میں آئی، اس ضمن میں بعض نئے مسائل بھی زیر بحث آئے ہونگے مگر یہ ان کے موضوع سے خارج تھا۔

حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحبؒ، حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ اور ان کے بعض خلفاء وتلامذہ نے البتہ اس جانب توجہ فرمائی، اور کئی اہم مسائل پر آپ نے کام کئے، حضرت قاضی صاحبؒ کا کام در اصل اس کام کی تکمیل تھی، جس کا آغاز ہمارے علماء میں ان بزرگوں سے ہوا، قاضی صاحب ان بزرگوں کو اس باب میں اپنا پیشوا اور آئیڈیل سمجھتے تھے، اور اپنی اکثر تقاریر میں ان کی اجتہادی مساعی کا بڑے وقیع الفاظ میں ذکر فرماتے تھے، دوسرے فقہی سمینار (منعقدہ دہلی جس میں میں خود بھی پہلی بار شریک ہوا تھا) کے موقعہ پر قاضی صاحبؒ نے جو تقریر فرمائی تھی، وہ ان کے نقطۂ نظر اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے بنیادی مقاصد کو سمجھنے میں کافی اہمیت رکھتی ہے، قاضی صاحبؒ نے فرمایا تھا:

> "ائمہ کبار اور علماء اور اسلاف نے اپنے زمانے اور حالات کے اعتبار سے مسائل کا استخراج واستنباط کیا ہے، جس کی مفصل اور وقیع تاریخ ایسی مثال ہے کہ جس کی نظیر دنیا کے موجودہ مذاہب میں سے کسی مذہب میں نہیں، ایسی تاریخ اور ایسا ریکارڈ رکھتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی دور اور کسی زمانہ کے علماء دین اپنے دور اور اپنے زمانہ کے تقاضوں کی حقیقی تکمیل اور پیش آمدہ مسائل کے صحیح حل میں ہمت ہار جائیں، غفلت کی چادر اوڑھ کر سو جائیں، اور جمود ان پر طاری ہو جائے؟ جب پچھلے دور میں ایسا نہیں ہوا (اور کسی ابدی دین کے ساتھ ایسا معاملہ پیش بھی نہیں آسکتا)

---

[6] -شامی ج/۵ ص/۲۷۶، مطبوعہ کراچی

اور ہر زمانے کے علماء اپنے زمانہ کے حالات اور مسائل سے واقف ہو کر رہبری اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے، تو اس زمانہ کے علماء کو بھی اپنے زمانے کی ضرورتوں سے واقف ہونا پڑے گا، اور آج کی سائنسی ایجادات، طبی تحقیقات، معاشی ترقیات، مختلف سماجی وجغرافیائی حالات، حمل ونقل کے جدید ذرائع اور ترسیل وابلاغ کے نئے آلات نے نت نئے فقہی وشرعی مسائل جو پیدا کئے ہیں، ان کا حل پیش کرنا ہوگا، حساس علماء نے اپنے وقت کے علماء کی توجہ اس طرف ہمیشہ مبذول کرائی ہے، نابغۂ روزگار عالم دین مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر جب پاکستان سے ہندوستان تشریف لائے تو بار بار فرماتے کہ:

"اس وقت نئے نئے مسائل سامنے آرہے ہیں، اور ایسے علماء کی ضرورت ہے جو ان مسائل کا تشفی بخش جواب دے سکیں، اس لئے فقہ کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ کرنا چاہیئے[7]"

خوشی کی بات ہے کہ عالم اسلام کے علماء وفقہاء اس طرف متوجہ ہیں، اور مختلف ممالک میں فقہی اکیڈمیاں قائم ہیں، جہاں مختلف انداز سے ان مسائل پر کام ہو رہا ہے، ماضی قریب کے ہندوستانی علماء میں مولانا ابو المحاسن سجاد صاحبؒ، مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس سلسلے میں جو کوششیں کی ہیں، وہ نہ صرف لائق تحسین بلکہ قابل تقلید بھی ہیں، اور ان کے کام کو آگے بڑھانا اور پھر اس طرح کے کام کو باہم مربوط کرنا اور مسلک ومشرب اور تنظیم وادارہ کے اختلاف سے بالاتر ہو کر فریق کے بجائے رفیق کے احساس کے ساتھ اجتماعی شکل میں ان مسائل پر غور کرنا بلاشبہ وقت کا اہم تقاضا ہے[8]

---

[7] – مطالعہ سلیمانی ص ۱۳۸

[8] – مجلہ فقہ اسلامی ج ۲ ص ۱۴

اجتماعی اور انفرادی اجتہاد میں فرق

اس لئے اب یہ سوال اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ مسائل کے استنباط واستخراج یا ترجیح وتخریج کے لئے جس درجہ کے علم وکمال کی ضرورت ہے کیاوہ قاضی صاحبؒ یاان کی مجلس کے شرکاء میں موجود تھی؟اور حنفیہ نے فقہاء کے جو سات(۷)طبقات بیان کئے ہیں، یہ حضرات ان میں سے کس طبقے میں داخل ہیں؟

اس لئے کہ علم وکمال کا یہ معیار یاطبقات فقہاء میں کسی طبقہ کی تعیین انفرادی اجتہاد و تقلید میں مطلوب ہے، اجتماعی اجتہاد میں نہیں، ورنہ ماضی قریب وبعید میں اجتماعی اجتہاد کی جو چھوٹی بڑی کوششیں ہوئی ہیں ان سب میں اس معیار کی تحقیق کی جاتی، اور اس کی تعیین کے بعد ہی ان کے پیش کردہ فقہی فیصلوں کو شرعی اعتبار حاصل ہوتا ہے، اور اس قسم کا سوال سابقہ فقہی مساعی پر بھی اٹھایا جاتا، مگر اس قسم کے کسی سوال وجواب کا ذکر سابقہ فقہی مساعی کی تاریخ میں نہیں ملتا۔۔۔ اجتماعی اور انفرادی کا یہ وہ فرق ہے جس سے ذہول ہو جانے کی بناپر بعض معاصر علماء کے ذہنوں میں مذکورہ سوال پیدا ہوا، اور اس سوال کے حوالہ سے قاضی صاحبؒ کی شخصیت کو بلاوجہ تنقید کانشانہ بنایا گیا۔

یہ اصطلاحی اجتہاد نہیں ہے

علاوہ ازیں اجتماعی غور وتحقیق دراصل اصطلاحی اجتہاد ہی نہیں ہے کہ اس کے لئے اجتہاد مطلق ، اجتہاد فی المذہب یااجتہاد فی المسائل کی تشقیق وتحقیق کی جائے، اور اس مسئلہ پر غور کیا جائے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے یاکھلا؟اور کس قسم کے اجتہاد کی آج گنجائش ہے؟

میں نے محسوس کیا کہ ان حضرات کے ذہنوں میں اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی، ان کے سامنے صرف اتنی سی بات تھی کہ نئے مسائل وحوادث کا حل بہر حال امت کے سامنے آنا چاہیئے، اور قانون اسلامی کے جو اصول وکلیات ہیں ان کی تطبیق موجودہ حالات و واقعات پر ہونی چاہیئے، امت کو اندھیرے میں نہیں رکھا جاسکتا اسلام ایک ابدی نظام حیات ہے، ہر دور کی ضروریات اور تقاضوں کا حل

لازماً اس کے پاس موجود ہے، بس شرط یہ ہے کہ اس میں غور کیا جائے، نئے مسائل کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ سابقہ بزرگوں نے ان کا حل اپنی کتابوں میں نہیں لکھا ہے اس لئے ہم کوئی حل پیش کرنے سے قاصر ہیں، اگر یہ زندہ مذہب اور زندہ امت ہے تو ہر حال میں اس کا حل پیش کرنا ہوگا، اور یہ امت کبھی بانجھ نہیں ہو سکتی، ہر دور میں ایسے افراد بہر حال موجود رہیں گے جو اسلام کی ابدیت کی توثیق و تشریح کرتے رہیں گے، صحابہ کرام کو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑا، جن سے ان کو عہد نبوت میں سابقہ نہیں پڑا تھا، مگر انہوں نے یہ عذر کبھی پیش نہیں کیا کہ چونکہ یہ مسئلہ عہد نبوت میں پیش نہیں آیا تھا اس لئے ہمارے لئے ان کا حل پیش کرنا مشکل ہے، بلکہ انہوں نے اجتہاد کیا اور غور و فکر کے بعد ان کا شرعی حل پیش کیا۔

قاضی صاحبؒ نے دوسرے فقہی سمینار کی ایک نشست میں بحث کے دوران اپنے اس موقف کا بڑا واضح اظہار فرمایا تھا:

> "کہہ سکتے ہیں کہ بالکل اجتہادی طور پر چند فیصلے کرنے ہیں۔۔ مگر۔۔ ایک ہے اجتہاد مصطلح اور ایک ہے بدلتے حالات میں نیا حکم دینا، دونوں میں فرق ہے، دو اصول اکثر کتابوں میں مذکور ہیں، سلف سے عدول کرتے ہوئے جب مسئلہ بیان کیا جاتا ہے تو عبارت یوں ملتی ہے "لوکانوافی ھذاالزمان لقالوابماقلنا" کوئی شک نہیں کہ احکام کی دو قسمیں ہیں، ایک تو ابدی جن پر حالات اور زمانہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا، دوسرے وہ احکام ہیں جن پر حالات کا اثر پڑتا ہے،، عادات، حالات، زمانے کے تقاضوں اور عرف پر مبنی ہوتے ہیں، جب عادات وحالات اور زمانہ کے تقاضوں میں تغیر پیدا ہو جائے تو تغیر سے پہلے جو حالات تھے انہی احکام پر تغیر کے بعد بھی اصرار کرنا تفقہ سے جوڑ نہیں کھاتا۔

فقیہ جس طرح سر چشمۂ علوم شریعت سے تعلق رکھتا ہے اسی طرح وہ وقت کا بھی نباض ہوتا ہے، حضرت امام محمدؒ بازار میں گھومتے تھے اور لوگوں کے حالات معلوم

کرتے تھے۔

> وہ احکام جو حالات پر مرتب ہوتے ہیں ہر حالت میں انہی پر اصرار کرنا صحیح نہ ہو گا، میری حیثیت نہیں کہ میں کہہ سکوں لیکن امام قرافیؒ کہتے ہیں کہ یہ اجتہاد نہیں ہے بلکہ حالات کے تغیر کی صورت میں تطبیق ہے، اس لئے علماء مسئلۂ نسخ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ایجاد حکم نہیں ہے، بلکہ کشف حکم ہے"[9]

اجتہاد کے تعلق سے قاضی صاحب کا نقطۂ نظر

اس موقعہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد کے تعلق سے قاضی صاحب کے بعض فقہی نظریات وآراء پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، اس سے قاضی صاحب کی علمی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی:

اجتہاد کے موضوع پر قاضی صاحبؒ کا ایک مفصل مقالہ "اسلامی عدالت" کے مقدمہ میں موجود ہے، اس میں قاضی صاحبؒ نے اس موضوع کے تمام ہی بنیادی گوشوں پر نظر ڈالی ہے، اور بصیرت افروز بحث کی ہے، اجتہاد کی حقیقت، اس کے عناصر ترکیبی، مجتہد کے فرائض، اہلیت اجتہاد کی شرطیں، تجزیٔ اجتہاد کی بحث، اجتہاد جاری ہے یا موقوف؟ اجتہاد میں مطلوبہ طریق کار وغیرہ بہت ہی اہم گوشے اس مقالے میں آگئے ہیں، تقریباً اس موضوع پر بکھرے ہوئے مباحث کا لب لباب قاضی صاحبؒ نے اپنے اس مقالے میں پیش کر دیا ہے، اس مقالے کے بعض وہ اقتباسات پیش ہیں جن سے اجتہاد کے بارے میں قاضی صاحب کا نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔

اجتہاد کے عناصر ترکیبی

> "اجتہاد کے عناصر ترکیبی تین ہیں: مجتہد، محل اجتہاد اور طریقۂ اجتہاد، جیسے مجتہد میں اہلیت اجتہاد ضروری ہے، اسی طرح محل اجتہاد یعنی ان مسائل کا تعین بھی

---

[9] - مجلہ فقہ اسلامی ج ۲ ص ۵۴۲

ضروری ہے، جن میں اجتہاد کی گنجائش ہے، اگر اہلیت اجتہاد مفقود ہو گی، تو شریعت عقل عیار کے لئے بازیچۂ اطفال بن جائے گی، اور اگر محل اجتہاد کا تعین نہیں ہو گا تو محل منصوص کو اجتہاد کا نشانہ بنا کر نصوص شریعت کو منہدم کیا جائے گا، حالانکہ ہر وہ اجتہاد جو نص سے معارض ہو مردود ہے"

محل اجتہاد کے بارے میں اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر وہ مسئلہ جن کے بارے میں کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں کوئی نص قطعی وارد ہو یا کسی حکم پر امت کا اجماع ہو چکا ہو اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔۔۔۔۔ اب اگر بزعم خود مجتہدین کا ایک ٹولہ اٹھے اور کہنا شروع کر دے کہ نماز دو ہی وقتوں کی ضروری ہے، تو یہ اجتہاد مردود قرار پائے گا۔

کوئی زمانہ مجتہد سے خالی ہو سکتا ہے یا نہیں؟

کار اجتہاد جاری ہے یا نہیں اور کوئی زمانہ مجتہد سے خالی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس تعلق سے علماء کے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد ان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہمارے نزدیک ان واقعات وحالات کی روشنی میں جو پچھلے طویل زمانہ سے پیش آرہے ہیں یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ کسی زمانہ کا مجتہد سے خالی ہونا ممکن نہیں ہے کہ واقعات وحالات اس نظریہ کا ساتھ نہیں دیتے، لیکن اتنی بات تو واضح ہے کہ اس قول کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ متأخرین میں کسی صاحب اجتہاد شخص کا پیدا ہونا ناممکن ہے، حقیقت یہ ہے کہ ذکاوت و فطانت اور ذہن رسا کی نعمت اللہ نے چھین نہیں لی ہے، وسائل اجتہاد اور علوم و معارف کے خزانوں تک رسائی عہد متأخرین میں جس طرح آسان ہو گئی ہے پہلے کبھی نہیں تھی، سلف کی محنت آج روزانہ مدفون کتب خانوں سے نکل کر اس تیزی کے ساتھ سامنے آرہی ہے، کہ جس کا پہلے تصور مشکل تھا، ان عظیم علمی خزانوں کو دیکھ کر برجستہ کہنا پڑتا ہے، "اخرجت

الارض اثقالها"[10]، لیکن مسئلہ نہ ذکاوت وفطانت کا ہے نہ فہم صحیح کا، نہ وسائل علم اور خزانۂ علمی تک رسائی کا، اصل مسئلہ ہماری کوتاہ ہمتی کا ہے، مشاغل علمیہ سے گریز کا ہے، علم کی راہ میں شب بیداری کے فقدان کا ہے، فکر میں عدم توازن اور بے اعتدالی کا ہے، خوف آخرت اور دین میں احتیاط کی کمی کا ہے، ورع وتقویٰ کے فقدان کا ہے اور نتیجتاً اہلیت اجتہاد کے ناپید ہونے کا ہے اور اگر اہلیت جہاد مفقود ہو، اور پھر اجتہاد کی اجازت دی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ حدیث رسول کے مطابق " ضلوا فاضلوا[11]"(ترجمہ: خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا)ہی ہو سکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اجتہاد کے بہت سے مراتب ہیں: ضروری نہیں کہ سبھی مجتہدین اپنی سبھی صلاحیتوں میں مساوی ہوں، کم سے کم اور ضروری حد تک اہلیت اجتہاد موجود ہو، تو پھر اس کے بعد اپنی اپنی محنت، صلاحیت اور اللہ کی عنایت سے مجتہدین میں فرق مراتب پیدا ہو سکتا ہے، اور کسی کا علم کسی سے زیادہ ہو سکتا ہے، کہ "فوق کل ذی علم علیم"[12]۔۔۔۔۔۔۔۔اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ابو حنیفہؒ، ابو یوسفؒ، محمد بن حسنؒ، زفر بن ہذیلؒ، عافیۃ بن یزید الاودیؒ، مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، سفیان ثوریؒ، ابن جریر طبریؒ، ابو ثورؒ، امام طحاویؒ، امام بویطیؒ اور اس درجہ کے لوگ تو ہر زمانے میں نہیں پیدا ہوئے لیکن قفالؒ، ابن دقیق العیدؒ، عز بن عبد السلامؒ، قاضی خانؒ، برہان الدین مرغینانیؒ اور علامہ کمال الدین ابن ہمامؒ جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں، جن کے بارے میں بہت سے علماء کی رائے ہے کہ یہ حضرات

---

[10] - سورہ زلزال ۲

[11] - مسلم شریف باب فی فیض العلم رقم الحدیث:۱۸۵۸۲

[12] - سورہ یوسف:۷۶

صاحب اجتہاد تھے، اس آخری دور میں شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کی اہلیت اجتہاد سے کسے انکار ہو سکتا ہے ؟ اور اگر یہ ضروری نہیں کہ مجتہد اپنے مجتہد ہونے کا دعویٰ کرے تو اس آخری عہد اور ماضی قریب میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اجتہادی صلاحیتوں اور ان کے مجتہدانہ فتاویٰ کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے ؟

خیال رہے مجتہد کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ سلف کی تحقیقات کی بساط الٹ کر اپنی طرف سے کوئی نئی بات کہہ دے تو مجتہد ہے، حضرت تھانویؒ نے جس طرح اپنے عہد کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے پیش آمدہ مسائل کا حل کیا ہے، قواعد شرع پر جیسی ان کی گہری نگاہ ہے، اقوال سلف کی جس طرح وہ رعایت کرتے ہیں، تاکہ خرق اجماع لازم نہ آئے، مناط حکم پر جیسی ان کی نگاہ رہتی ہے اور فتویٰ میں جس شدت احتیاط اور ورع و تقویٰ کو وہ برتتے ہیں، ان کی نادرۂ روز گار شخصیت سلف کے فقیہ النفس علماء کی یاد دلاتی ہے، مجھے یہ احساس ہے جو کان لفظ اجتہاد کو سننا گوارہ نہیں کرتے انہیں میرا یہ کہنا بھی شاید پسند نہ آئے، کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد حضرت تھانویؒ نے ہندوستان میں کار اجتہاد انجام دیا، اگرچہ انہوں نے ہمیشہ اپنے کو مقلد کہا ہے اور مقلد سمجھا ہے، اور ایسے کسی بھی قول سے پرہیز کیا ہے جس کی نظیر اقوال سلف میں نہیں ملتی ہو۔

اجتہاد ایک نازک ترین ذمہ داری ہے

یہ حقیقت ہے کہ اجتہاد ایک نازک ترین ذمہ داری ہے، اگر ہر کس وناکس کو اجتہاد کی اجازت دے دی جائے تو دین ایک کھیل بن کر رہ جائے گا، خواہشات نفس کی پیروی کی جائے گی،، مصالح شرعیہ، اور مقاصد تشریع کو نظر انداز کر دیا جائے گا، اور شریعت کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، کار اجتہاد کی نازک ذمہ داری اگر نااہل افراد یا ایسے لوگوں کے حوالہ کر دی جائے جو خوف خدا سے خالی اور خشکی وتری

میں بے محابا چگنے کا مزاج رکھتے ہیں تو یقین ہے کہ یہ اصول اجتہاد سے ناواقف اور اہلیت اجتہاد سے محروم لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے خود بھی گمراہ ہونگے اور اللہ کی مخلوق کو بھی گمراہ کریں گے، آج کے عہد کی ایک بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ لوگ جو مکان کی تعمیر سے لیکر معاشی مسائل تک اور پرائمری اسکول سے یونیورسیٹی کی تدریس تک یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں، مہارت، تربیت، تجربہ، تخصص (SPECIALISATION) کو ضروری تصور کرتے ہیں وہ دین کے معاملہ میں ناکارہ سے ناکارہ شخص کو رائے دینے اور اجتہاد کرنے کا اہل سمجھتے ہیں، اور دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ آج جو لوگ اجتہاد اجتہاد کا نعرہ بآواز بلند لگارہے ہیں، ان میں اکثر وہی لوگ ہیں جو اس دور کے منکرات وفواحش اور اللہ کے دین کی حرمتوں کو اجتہاد کے مقدس نام پر محض اپنی خواہش نفس کی تکمیل کے لئے حلال کرنا چاہتے ہیں"

تجزیٔ اجتہاد کا مسئلہ - نقطۂ عدل

"تجزیٔ اجتہاد کے مسئلہ" پر اقوال علماء اور سلف کی بعض تحقیقات کا حوالہ ذکر کرنے کے بعد اپنا نقطۂ عدل پیش فرماتے ہیں:

"آج کے عہد میں اس مسئلہ کی خاص اہمیت اس لئے ہے کہ مجتہد کامل مفقود ہے اور بہت سے ایسے مسائل درپیش ہیں جو عہد سلف میں پیش نہیں آئے تو ان مسائل کے حل کے لئے ایسے علماء اقدام کرسکتے ہیں جو کسی خاص باب میں اپنی وسعت علمی، کمال اور تحقیق کی بدولت مناط حکم کی تخریج کے اہل ہوں تاکہ ایسے جدید مسائل کا حل ممکن ہو، اور جیسا کہ ذکر کیا گیا جمہور کی رائے میں یہ درست ہے لیکن اس موقعہ پر ابن الزملکانی کی یہ رائے میرے نزدیک زیادہ معقول ہے، کہ اہلیت اجتہاد کی شرائط دو طرح کی ہیں، ایک تو وہ صلاحیتیں ہیں جن کا تعلق مطلق اجتہاد سے ہے، قطع نظر اس سے کہ اجتہاد احکام صلوٰۃ میں کیا جائے یا احکام بیوع یا کسی اور باب فقہ

میں، اور بعض وہ شرائط ہیں جن کا تعلق اس مخصوص باب سے متعلق معلومات سے ہے، مثلاً قوت استنباط، مفہوم کلام کو سمجھنے کی صلاحیت، کون سی دلیل قابل قبول ہے اور کونسی نہیں، یہ اور اس طرح کی دوسری صلاحیتیں ہر مجتہد کے لئے ضروری ہیں، چاہے وہ ایک مسئلہ میں اجتہاد کرے یا جملہ احکام دین میں پس اس طرح کی کلی صلاحیتوں میں تجزی کا سوال پیدا نہیں ہوتا، البتہ دوسری قسم کی صلاحیتوں میں تجزی ہوسکتی ہے، اور اصل قوت اجتہاد موجود ہو تو کسی خاص باب سے متعلق علم کی وسعت کے اعتبار سے یہ جائز ہوگا کہ ایک باب میں وہ اجتہاد کرے اور دوسرے باب میں اجتہاد نہ کرے، محقق ابن امیر الحاجؒ نے ابن الزملکانیؒ کی اس رائے کو "حسن" قرار دیا ہے[13]

فکری توازن اور مسلکی اعتدال

اس طرح قاضی صاحبؒ نے مختلف اہم فقہی مسائل پر محققانہ کلام فرمایا ہے، جس میں فکر و تحقیق کا اعتدال بھی ہے، اور عصر حاضر کے شدید علمی خلا اور جدید پیش آمدہ مسائل کی حساسیت بھی، قاضی صاحبؒ کو اپنے دور کے حالات کی پوری خبر تھی، اہل تحقیق علماء کی کمی، اباحیت پسند مدعیان اجتہاد ٹولے کی کثرت اور نت نئے مسائل وواقعات کی شرح میں اضافہ کا ان کو بڑا احساس تھا، ان کی تحریرات میں جہاں علمی تحقیقات ملتی ہیں، اور مختلف فیہ مسائل میں نقطہائے عدل سامنے آتے ہیں، وہیں عہد حاضر کے تلخ احساسات بھی چھلکتے نظر آتے ہیں، ان کی تحریرات سلف کی تحقیقات اور جدید تر حسیت کی آئینہ دار ہیں، ایسی تحریرات جن کی اس دور کو ضرورت ہے، زندہ، متحرک اور حالات اور تقاضائے وقت سے ہم آہنگ تحریرات"

قاضی صاحب مسلکی طور پر انتہائی متصلب اور پختہ فکر و نظر کے مالک تھے، مگر شدت و تنگ

---

[13] - التقریر والتحبیر ج۳ص۲۹۴، اسلامی عدالت ص ۵۴ تا ۸۳، طبع اول

نظری نہیں تھی، وہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے بڑی حد تک توسع کے قائل تھے، مگر جدید اباحیت پسندی اور فکری انارکی کے سخت خلاف تھے وہ اپنی تقریر و تحریر دونوں میں اس کے خلاف بولتے اور لکھتے تھے، میں نے محسوس کیا کہ اس باب میں بھی ان کے یہاں بڑا اعتدال تھا، عام طور پر لوگ دو سمتوں میں سے کسی ایک سمت ڈھل جاتے ہیں، قاضی صاحبؒ اس مسئلہ کی روح کو پا گئے تھے، تلفیق اور شرعی رخصتوں پر قاضی صاحبؒ کا ایک مفصل مضمون "بحث و نظر" میں شائع ہوا تھا، جو بعد میں قاضی صاحب کے مجموعۂ مقالات "مباحث فقہیہ" کی زینت بنا، قاضی صاحب نے اس اہم اور نازک مسئلے کا شاندار تجزیہ فرمایا ہے، اور اپنا طبعی رجحان بھی تحریر فرمایا ہے، میرے خیال میں قاضی صاحبؒ کے فکری توازن اور مسلکی اعتدال کو سمجھنے کے لئے یہ مقالہ کافی اہمیت رکھتا ہے، اگر اہل نظر انصاف کے ساتھ اس مقالہ کا مطالعہ کریں تو قاضی صاحبؒ کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکیں گے، اور افواہوں اور بدگمانیوں کے گرد و غبار دھلتے چلے جائیں گے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالہ کے بعض اقتباسات بھی اہل نظر کی خدمت میں پیش کروں:

رخصت واباحت کی بحث میں نقطۂ اعتدال

"تتبع رخص" (رخصتوں کی تلاش) پر علماء سلف کی تحقیقات پیش کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

> "فقہاء اور علماء اصول کے اقوال کی تلاش و تفحص کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں ان کے تین نقطہائے نظر ہیں۔
>
> اول: یہ کہ تتبع رخص مطلقاً ممنوع ہے، خواہ یہ تشہی یا تخفیف کی غرض سے ہو یا اعذار و مرض کی وجہ سے ہو۔
>
> دوم: تتبع رخص مطلقاً جائز ہے، اس کے لئے کوئی قید اور شرط نہیں ہے۔
>
> سوم: عام حالات میں تتبع رخص ممنوع ہے اور خاص حالات مثلاً ضرورت یا مرض یا کسی عذر کی وجہ سے جائز ہے۔۔۔۔۔

اس مسئلے میں جس قول کی طرف میرا رجحان ہے اس میں قدرے تفصیل ہے، اور وہ یہ ہے کہ تتبع رخص عام حالات میں تشہی، لہو ولعب اور خواہشات کی پیروی کی بنیاد پر ناجائز ہے، ہاں اگر کسی خاص مسئلہ میں عذر یا مرض کی ضرورت کی بنیاد پر ہو تو مخصوص شرائط کے ساتھ جائز ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت نے جہاں خواہشات کی اتباع اور لہو ولعب سے روکا ہے، وہیں دوسری طرف احکام میں یسر وسہولت کے پہلو کی بھی رعایت کی ہے، اور دین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی تنگی نہیں رکھی ہے، اور نبی ﷺ کو سیدھے اور آسان دین کے ساتھ بھیجا گیا ہے، لہذا اس مسئلہ میں دونوں پہلوؤں کی رعایت ضروری ہے، اور میری سمجھ میں یہ آرہا ہے (واللہ اعلم) کہ وہ تتبع رخص جو ممنوع ہے اور جس کے ممنوع ہونے پر بعض حضرات نے اجماع کا دعویٰ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان ہر مسلک میں اس قول کو اختیار کرے جو اس کے لئے آسان ہو، اور یہ کسی واقعی عذر اور ضرورت کے پیش نظر نہ ہو، بلکہ محض خواہش نفس کی پیروی میں ہو، کیونکہ اگر اس کا دروازہ کھول دیا جائے تو یہ شریعت کے احکام سے آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے گا، اور دین کھلونا اور مذاق بن کر رہ جائے گا، تتبع رخص کی اس قسم میں یہ صورت داخل ہے کہ انسان تشہی اور لہو ولعب کی غرض سے مختلف مسائل میں مختلف فقہاء کے اقوال اختیار کرے۔۔۔۔ اور جہاں تک خاص حالات میں رخص مذاہب سے استفادہ کی بات ہے، مثلاً زوج مفقود الخبر کے مسئلے میں اور بعض دوسرے مسائل میں فقہاء حنفیہ نے امام مالکؒ کے قول کو اختیار کیا ہے، اسی طرح فقہاء شافعیہ نے فقہ مالکی اور فقہ حنفی کے بعض اقوال کو اختیار کیا ہے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ اگر ہم ایک مجتہد کے قول پر عمل کو ضروری قرار دیں تو عصر حاضر کے مشکل اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنا ممکن نہ ہوگا، بالخصوص نئے تجارتی معاملات میں، اور نہ یہ بات

کسی طرح مناسب ہو گی کہ ہر مکلف کو اس کی رخصت دی جائے کہ وہ اپنی زندگی کے مسائل میں اپنی خواہشات کے مطابق جس قول کو چاہے اختیار کرے۔۔۔۔ اور یہ بات مخفی نہیں کہ اتباع شریعت میں تکلیف ہوتی ہے، اور مشقتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے، لہذا شریعت کا کوئی حکم مشقت سے بالکلیہ خالی نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر حکم شرعی میں کچھ نہ کچھ مشقت ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالی کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا پس حرج ومشقت اور تنگی کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔

مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں ائمہ کے اقوال میں آسان قول کو اختیار کرنے کے سلسلے میں کوئی ضابطہ مقرر کر دیا جائے تاکہ تباہ کن اباحیت پسندی اور دین سے متنفر کرنے والی تنگی دونوں کا سد باب ہو سکے، اس سلسلے میں درج ذیل اصول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

۱۔۔۔الامر اذاضاق اتسع، مشہور فقہی قاعدہ ہے، اس کی مدد سے جب کسی مسئلے میں تنگی پیدا ہو گی تو شریعت اس تنگی کو دور کر کے وسعت پیدا کرے گی، جب کسی مبتلی بہ کو کسی امر میں ایسی تنگی، حرج اور دشواری پیش آئے جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا تو ایسی صورت میں اس کے لئے جائز ہو گا کہ وہ کسی دوسرے امام کے قول کو اختیار کرے، جس میں دفع حرج ومشقت ہو۔

۲۔۔۔لیکن اس صورت میں اس پر لازم ہو گا کہ وہ ان ارباب علم وذکر اور اصحاب فتویٰ سے رجوع کرے جو دین کا گہرا علم رکھتے ہوں،، اور ورع وتقویٰ کی صفت سے متصف ہونے کی وجہ سے دین کی اساس اور بنیاد سمجھے جاتے ہوں تاکہ وہ خواہش نفس اور شیطان کے مکر وفریب کا شکار نہ ہو، کیونکہ ایک عامی انسان بسا اوقات ضرورت اور اتباع ہویٰ کے درمیان فرق نہیں کر سکتا ہے۔

۳۔۔۔اس پر لازم ہے کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب سے تجاوز نہ کرے جو صدیوں سے مدون اور منقح صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں، اور جن پر زمانۂ قدیم سے عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔

۴۔۔۔لیکن مسئلہ عموم بلویٰ کی وجہ سے اجتہادی ہو گیا ہو، یا ایسا مسئلہ ہو جو حالات اور زمانہ کی تبدیلی یا نئے عرف کی وجہ سے پیدا ہوا ہو، خاص طور پر لوگوں کے معاملات، مثلاً، تجارت، صنعت و حرفت اور تجار، صنعت کار اور اہل پیشہ کی عادات سے متعلق ہو، خصوصاً بین الاقوامی معاملات میں تو ایسی صورت میں علماء راسخین اور اصحاب تقویٰ فقہاء پر یہ لازم ہے کہ وہ ان مشکلات اور پیچیدہ مسائل کا حل شریعت کے مقاصد اور قواعد کلیہ کی روشنی میں نئے حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کے ذریعہ تلاش کریں اور ان کے لئے ائمۂ ہدیٰ میں سے کسی ایک کے قول کی طرف درج ذیل شرطوں کے ساتھ عدول کرنا جائز ہے۔

(۱) دوسرا قول شاذ نہ ہو، (۲) نصوص سے ٹکراتا نہ ہو[14]

مسئلہ تلفیق

مسئلۂ تلفیق پر مفصل گفتگو کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"تلفیق کا مسئلہ تقلید کے زمانہ میں پیدا ہوا، جب مشہور مذاہب کے فقہاء نے دیکھا کہ اسلامی معاشرہ میں ورع و تقویٰ کی کمی ہے، اور لوگوں میں خواہش نفسانی کی پیروی کا سخت میلان پایا جاتا ہے، تو ان میں سے بہت سے حضرات نے سد ذریعہ کے طور پر اور تشہی، فسق و فجور اور شرعی احکام سے آزادی حاصل کرنے کے رجحان کو ختم کرنے کے لئے تقلید کو واجب قرار دیا۔

---

[14] ۔مباحث فقہیہ ص ۱۲۷ تا ۱۳۰

فقہاء کی جو تصریحات ہم نے ذکر کی ہیں ان سے واضح ہے کہ تلفیق کے مسئلہ میں علماء اصول اور حضرات فقہاء کے تین مذاہب ہیں:

۱- تلفیق مطلقاً جائز ہے۔

۲- تلفیق مطلقاً ناجائز ہے۔

۳-چند شرائط کے ساتھ جائز ہے،۔۔۔۔۔۔(پھر ان آراء پر تبصرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں)

خلاصۂ کلام یہ کہ وہ تلفیق ممنوع ہے، جس کا مقصد واجبات وفرائض سے رہائی حاصل کرنا، خواہشات نفس کی پیروی کرنا، اور محرمات شرع کے ارتکاب کے لئے حیلہ جوئی ہو،، لیکن صحیح مقاصد کے لئے درج ذیل شرائط کے ساتھ تلفیق جائز ہے:

اول: تقلید کے طور پر جو عمل ہو چکا ہے، اس سے رجوع لازم نہ آئے، مثلاً ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا" انت طالقۃ البتۃ" تجھے قطعی اور یقینی طلاق ہے، اور اس سے اس کی نیت تین طلاق کی ہے، پھر اس نے اس مسئلہ میں اپنی رائے کو نافذ کیا اور یہ یقین کر لیا کہ وہ عورت اس پر حرام ہو چکی ہے، پھر اس کی رائے یہ ہوئی کہ اس طلاق کو رجعی قرار دے کر اس سے رجعت کر لے اور اپنی زوجیت میں باقی رکھے۔

دوم: یہ کہ اس سے اس کے لازم اجماعی (یعنی پہلے تقلید کے طور پر عمل کرنے کی وجہ سے جو صورت لازم آتی ہے) سے رجوع لازم نہ آتا ہو، مثلاً ایک شخص نے بغیر ولی کے نکاح کے صحیح ہونے میں امام بوحنیفہؒ کی تقلید کی اور ایک بالغہ لڑکی سے بلاولی نکاح کر لیا تو اس میں شک نہیں کہ اگر نکاح کی صحت تسلیم کر لی جائے تو اس سے طلاق واقع کرنا بھی لازماً صحیح ہو گا، تو اگر یہ شخص اپنی منکوحہ کو جس سے بغیر ولی کے نکاح کیا ہے، تین طلاق دیدے، پھر طلاق واقع نہ ہونے میں امام شافعیؒ کی تقلید کرنا چاہیئے (کہ امام شافعیؒ کے مسلک کی رو سے یہ نکاح ہی صحیح نہیں ہوا، کیونکہ بغیر ولی

کے تھا) تو ایسا کرنا اس کے لئے جائز نہ ہو گا کیونکہ یہ سابق تقلید کے نتیجے میں لازم آنے والے لازم اجماعی حکم سے رجوع کرنا ہے۔

سوم: یہ کہ علماء کے نادر اور شاذ اقوال کو اختیار نہ کرے کیونکہ علماء کے وہ نادر اور شاذ اقوال جنہیں امت نے مسترد کر دیا ہے، اور قبول نہیں کیا ہے، انہیں اختیار کرنا جائز نہیں ہے، امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں، جو شخص علماء کے نادر اقوال کو اختیار کرے گا ، وہ اسلام سے نکل جائے گا،، سلیمان تیمیؒ کہتے ہیں: اگر تو ہر عالم کی رخصت اختیار کرے تو تجھ میں تمام برائیاں جمع ہو جائیں گی، اور علماء کے شاذ و نادر سے مراد وہ اقوال ہیں جنہیں زلات (لغزشیں) کہا جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر ہم تلفیق اور تتبع رخص کو مطلقاً مباح قرار دیں، تو یہ امت کے لئے فتنہ اور آزمائش کا سبب بنیں گے، ہاں اگر قابل اعتماد فقہاء کرام دور جدید کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور امت سے حرج اور تنگی کو دور کرنے کے لئے ضروری شرائط کے ساتھ رخصت اور تلفیق کو اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کریں تو میری رائے میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، یا جب یہ کام علماء راسخین کے اجتماعی اجتہاد کے نتیجے میں انجام پائے[15]

اختلافی مسائل میں نقطۂ اتفاق

قاضی صاحب فکر رسا اور فہم عمیق کے مالک تھے، اختلافی مسائل میں علت حکم کی یافت، اختلاف اقوال کی صورت میں تطبیق و توفیق، اور منشاء حکم کو سمجھنا ان کا امتیاز تھا، اکثر علماء اختلاف کی صورت میں الجھ کر رہ جاتے ہیں، اور کسی فیصلے تک نہیں پہونچ پاتے، قاضی صاحبؒ کو اللہ پاک نے یہ کمال دیا تھا کہ وہ اختلاف کی روح اور منشاء کو بھانپ لیتے تھے، اور جو مبدأ خلاف ہے وہیں سے گفتگو کا آغاز فرماتے

[15] - مباحث فقہیہ ص/ ۱۴۱ تا ۱۴۲

تھے، اور پھر مسئلہ ایک ایسے نتیجہ پر ختم فرماتے جو تمام اقوال وآراء کا نقطۂ اتفاق نظر آتا تھا، اب قاضی صاحب دنیا میں موجود نہیں ہیں کہ اختلافی مسائل کے بارے میں ان سے رجوع کیا جائے اور ان کی اس صلاحیت کا مشاہدہ کیا جائے، لیکن قریب سے استفادہ کرنے والے لوگ میری بات کی تائید کریں گے، قاضی صاحبؒ نے تصنیف وتالیف پر زیادہ توجہ نہیں دی ورنہ اس میں بھی اس کے بہت سے نمونے مل جاتے، وہاں تو زیادہ معاملہ تقریری تھا، اہل ذوق چاہیں تو قلمبند فرمالیں، ورنہ وہ بے نیاز تھے، کسی نے تحریری استفتاء ہی کر دیا تو جواب تحریر فرماتے تھے، قاضی صاحب کے مجموعۂ مقالات "مباحث فقہیہ" میں ایک اسی قسم کے استفتاء پر قاضی صاحب کا مفصل جواب موجود ہے، جو غالباً "بحث ونظر" کے کسی شمارے سے نقل کیا گیا ہے۔

مصر کی مختلف تعریفات کا محل

حنفیہ کے یہاں جمعہ کے لئے مصر کی شرط متفق علیہ ہے، مگر مصر کی تعریف میں اتنا شدید اختلاف ہے کہ کسی شہر کو مصر کی تعریف میں داخل رکھنا یا کسی دیہات کو اس سے خارج کرنا بہت مشکل ہے، بالخصوص وہ ممالک جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے ان علاقوں پر ان تعریفات کی تطبیق حد درجہ مشکل ہے، حنفیہ کے نقطۂ نظر سے ان ممالک میں قیام جمعہ کا مسئلہ پیچیدہ بن جاتا ہے۔

قاضی صاحبؒ نے اپنے جواب میں اولاً تمام تعریفات کا تجزیہ کیا اور حد جامع بننے کی کس میں صلاحیت ہے اور کس میں نہیں ہے؟ اس کا بہت ہی منصفانہ جائزہ لیا ہے، تفصیل کے لئے اصل مقالے کی طرف ہی رجوع کیا جائے، صرف نتیجۂ بحث پیش کرتا ہوں، قاضی صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں:

> "ان تمام اقوال اور مباحث کے مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں وہ یہ ہے کہ ان سارے اقوال میں حقیقتاً تضاد نہیں ہے، بلکہ تمام ہی اقوال دراصل ""مصر"" کی علامتوں کے اظہار کے لئے ہیں کہ حقیقتاً شہر کون ہے اور دیہات کون ہے؟۔۔۔۔۔ اصل حقیقت یہی ہے کہ ان تمام فقہاء وعلماء نے اپنے اپنے دور کے اعتبار سے مصر کی علامتوں کا تذکرہ کیا ہے اور تعریف میں کسی نے کوئی حد حقیقی

نہیں بیان کی ہے، اس لئے کہ قضاء یا تنفیذ احکام شرعی وغیرہ عارضی امور ہیں، جو کبھی موجود ہوتے ہیں اور کبھی نہیں، بہ خلاف مصر کے یہ ہمیشہ رہنے والی چیز ہے پس ایک مستقل چیز کی تعریف کا جوہری جز امر عارض نہیں ہو سکتا۔

شامیؒ نے اسی لئے لکھا ہے:

"علاوہ ازیں یہ کہ یہ ایک عارضی بات ہے، اس لئے اس کا اعتبار نہ ہو گا، اور اسی لئے اگر والی کا انتقال ہو جائے یا وہ کسی فتنہ کی وجہ سے خود حاضر نہ ہو سکے اور ایسا شخص کوئی موجود نہ ہو جس کو جمعہ قائم کرنے کا حق ہو، تو عام لوگ بدرجۂ ضرورت ایک خطیب مقرر کریں گے، باوجودیکہ یہاں سرے سے کوئی امیر و قاضی ہی نہیں ہے، اور اسی سے ان لوگوں کا جہل واضح ہو جاتا ہے، جو کہتے ہیں کہ ایام فتنہ میں جمعہ صحیح نہ ہو سکے گا، حالانکہ وہ ان شہروں میں بھی صحیح ہے، جن پر کفار کا غلبہ ہے[16]

پس مقصد ان ان تمام تعریفات کا ان آثار وعلامات کا اظہار ہے، جو اس دور میں مصر کے لوازمات و خصوصیات میں سے تھے، مثلاً یہی قضاء اور نفاذ احکام شرعی اور اقامت حدود والی بات ہے کہ فقہ حنفی کی رو سے ظاہر مذہب بھی یہی ہے، نفاذ قضاء کے لئے مصر شرط ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قاضی کا قیام مصر میں ہو گا، اور قضاء مصر میں ہی کی ہوئی نافذ ہو گی،۔۔۔۔۔۔۔ اور جب یہ شرط ٹھہری تو ظاہر ہے کہ کسی بھی جگہ قاضی کا قیام اس بات کی دلیل ہو گی کہ وہ مصر ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو آبادی بھی مصر ہو وہاں قاضی ضرور مقرر ہو، اور اگر مصر کو عام نہ مانیئے اور اس کا مصداق عرف سے متعین نہ کیجیے تو یہ الجھن پیدا ہو جاتی ہے کہ نفاذ قضاء مصر پر موقوف ہو اور کسی آبادی کا مصر قرار دیا جانا وہاں قاضی کے

[16] ۔شامی ج ا ص ۴۸۸

مقیم ہونے پر، اور پھر بڑی سے بڑی شہری آبادی اگر اتفاق سے وہاں تقرر قضاۃ نہ ہو تو وہ مصر بننے سے خارج ہو جائے۔

لہذا مذکور الصدر مباحث کی روشنی میں میرے نزدیک کون سی آبادی مصر ہے، اور کون سی قریہ، اور پھر کون سی آبادی قصبہ ہے، کون سی قریہ کبیر اور کون سی قریہ صغیر، اور شہریت کی کیا خصوصیات ہیں؟ قصبات کے کیا امتیازات ہیں؟ قریۂ کبیرہ کہتے وقت عموماً کن صفات کو سامنے رکھا جاتا ہے، ان تمام امور کو عرف پر محمول کرنا چاہیئے، جو عرف وزمانہ اور مختلف علاقوں کے فرق کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتا رہتا ہے، عرف ہی یہ فیصلہ کرے گا کہ کس آبادی کی کیا حیثیت ہے؟ یہ اصول اگر آپ تسلیم کرلیں تو فقہاء کی تعبیرات کے مابین جو الفاظ کے فرق ہیں ان سے آپ کو الجھن نہیں ہوگی، بلکہ اسے اختلاف عصر وعرف پر محمول کریں گے اور یہ سارے فرق "وھذا من اختلاف عصر وزمان لا من حجۃ و برھان" کے ذیل میں آئیں گے جن سے کسی ذہنی الجھن میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔

اب ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ان مختلف اقوال میں قدر مشترک کیا ہے؟ اس کا پتہ چلایا جائے، ان تمام اقوال پر نظر غائر ڈالنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ایک قریہ اور مصر کے درمیان جو فرق ہے اس کی بنیادیں دو ہیں: ایک تو آبادی اور مردم شماری کا فرق اور دوسرے مرکزیت ومرجعیت کا فرق، یعنی قریۂ صغیرہ کی آبادی بمقابلۂ قریۂ کبیرہ وقصبات ومصر علی العموم کم ہوتی ہے، دوسرے مصر میں ایک شان فی الجملہ مرکزیت کی ایسی پائی جاتی ہے کہ وہ علاقہ اور اطراف کے لوگوں کے لئے ایک درجہ میں مرجع بن جاتا ہے، پس آپ ان تمام تعریفات پر اس نقطۂ نظر سے غور کریں تو آپ کی الجھن دور ہو جائے گی، اور آپ محسوس

کریں گے کہ ان اقوال میں کوئی اضطراب نہیں ہے، بلکہ اس آبادی کی کثرت اور اس مقام کی مرکزیت کے اظہار کے لئے ہر فقیہ نے اپنے زمانے اور اپنے عصر کے اعتبار سے اس مرکزیت اور آبادی کی زیادتی کو جو اسے قریۂ کبیرہ یا قصبہ یا مصر کی تعریف میں داخل کر دے مختلف لفظوں میں تعبیر کیا ہے ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔۔۔۔۔۔

پس مندرجہ بالا تفصیلی مباحث کی روشنی میں میرے خیال میں فقہ حنفی کی رو سے

(الف) شہروں میں جمعہ واجب ہے

(ب) قصبات میں جمعہ واجب ہے

(ج) دیہاتوں میں جو دیہات بڑے اپنی آبادی کے اعتبار سے شمار کئے جاتے ہیں [17]

قاضی صاحب خالص حنفی تھے

قاضی صاحبؒ فقہی مسائل میں وسیع الفکر اور وسیع المشرب ضرور تھے لیکن سلف کی اتباع میں وہ حد درجہ متصلب تھے، سلف سے خروج کے وہ سخت خلاف تھے، وہ خالص حنفی تھے، مقلد تھے، تقلید یا حنفیت سے حتیٰ الامکان خروج نہیں کرتے تھے الا یہ کہ شدید حالات در پیش ہوں،ان کی فقہی آراء وتحقیقات میں سے ایک بھی فقہی نظریہ وتحقیق ایسی پیش نہیں کی جاسکتی جس میں قاضی صاحبؒ نے سلف یا حنفیت سے خروج کیاہو؟ان کی زیادہ تر تحقیقات کے پیچھے مسلک حنفی کی ظاہر الروایۃ نہیں تو کوئی نہ کوئی روایت ضرور مل جائے گی، بعض خاص حالات میں ضرورت وحاجت کی وجہ سے مذہب غیر پر فتویٰ دینا بھی حنفیت ہے اور کسی خاص مسئلے میں جزوی اجتہاد وتحقیق کی بناپر مذہب کی کسی رائے سے اختلاف خروج عن المذہب یاعدم تقلید نہیں ہے، ابن ہمامؒ اپنے دسیوں تفردات کے باوجود حنفیہ کے محقق ہیں، حضرت شاہ ولی الدہلویؒ مسلک حنفی سے علمی اور درسی طور پر اپنے کثیر اختلافات کے باوجود عملاً امام الحنفیۃ ہیں، اور

---

[17] -مباحث فقہیہ ص۱۹۰

بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ ابن جریر طبریؒ اپنے شدید اختلافات اور ایک نئے مکتب فقہی کے اختراع کے باوجود مذھب شافعی سے خارج نہیں ہیں وغیرہ، تو پھر قاضی صاحبؒ اپنے بعض جزوی اختلافات وتحقیقات (اگر وہ فی الواقع ہوں) کی بناپر مذہب حنفی سے خارج یا غیر مقلد کیسے قرار پاسکتے ہیں؟ فیاللعجب۔۔۔

میں نے جہاں تک قاضی صاحب کے فقہی آراء کا جائزہ لیا ہے، کہیں ان کو سلف حنفیہ سے خارج نہیں پایا، یہی "دیہات میں جمعہ کا مسئلہ" اس مسئلے میں بعض بڑے بڑے حنفی علماء کافی لچک دار نقطۂ نظر رکھتے ہیں جبکہ یہ حنفیہ کا متفق علیہ مسئلہ ہے، حضرت قاضی صاحبؒ نہ صرف یہ کہ اس باب میں پورے طور پر اس مسلک کے حامل ہیں بلکہ جو حضرات اس باب میں فتنہ وفساد وغیرہ کا عذر کرتے ہیں شرعی طور پر ان پر بھی برہم نظر آتے ہیں تحریر فرماتے ہیں:

"رہا یہ مسئلہ کہ جمع فی القریٰ کو روکنے کے نتیجے میں مسلمانوں میں اختلاف رونما ہوتے ہیں اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ جمعہ پڑھتا ہے اور دوسرا نہیں، اور دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو فاسق جانتا ہے اصل میں یہ ساری صورت حال جہالت اور مسائل میں بے جا تشدد اور رسوم کی اتباع کے نتیجے میں پیدا ہوگئی ہے، ظاہر ہے کہ جہالت کو دور کرنے، مسائل میں ہر مسئلہ کو اس کی جگہ رکھنے اور رسوم کی اتباع کے بجائے حقیقت دین اور صحیح احکام سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے، ورنہ آہستہ آہستہ عوامی دباؤ کے ساتھ صحیح مسائل کا اظہار دشوار ہو جائے گا۔

البتہ ممکن حد تک مسلمانوں کے درمیان فتنہ بننے سے احتراز ضروری ہے، اور ان مسائل کی تفہیم حکمت ودانائی کے ساتھ کی جانی چاہیئے، نہ کہ اس شدت کے ساتھ جو جزئیات کو اصول کے اختلاف کا درجہ دے، اور مسائل مجتہد فیہ کو منصوصات قطعیہ کا، لیکن بایں ہمہ محض ان اختلافات کے پیش نظر جن کا منشاء کوئی دلیل نہیں بلکہ ایک خواہش کی اتباع ہے، فقہی احکام کو بدل ڈالنا درست نہ ہوگا"[18]

---

[18] -مباحث فقہیہ ص۱۹۵

تفردات سے گریز

قاضی صاحبؒ کا مزاج تفردات سے گریز کا تھا، اکثر جدید سے جدید مسائل میں بھی وہ اقوال سلف کو اپنے لئے مشعل راہ بناتے تھے۔

جمعہ فی القریٰ کے مسئلے میں مصر کی تعریفات کے درمیان جس توفیق و تطبیق کا ابھی ذکر آیا وہ قاضی صاحب کی شخصی رائے نظر آتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں بھی وہ سلف کے متبع ہیں، اس کا تذکرہ خود انہوں نے اپنے مقالے میں کیا ہے فرماتے ہیں:

"اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ علماء امت میں سے دو بزرگوں کی تصریحات بھی درج کردوں جن میں سے ایک اپنے دور میں باب افتاء میں علماء واکابر کے درمیان مسلم شخصیت کے مالک رہے ہیں اور دوسرے بزرگ بڑے محقق اور ذخیرۂ علوم دینیہ پر حاوی اور اپنے غیر معمولی تفقہ کی وجہ سے ممتاز رہے ہیں۔

میری مراد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ ہیں ان دونوں بزرگوں کے اقوال کے مشاہدہ کے بعد آپ یہ محسوس کر سکیں گے کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے یہ کچھ میری اختراع نہیں ہے بلکہ ان بزرگان سلف کی اتباع ہے اور جو کچھ ان بزرگوں نے فرمایا ہے میں نے اس کی تفصیل کر دی ہے اور بس"[19]

اسی طرح مساجد کے اوپر یا نیچے مکانوں یا دکانوں کی تعمیر کے مسئلے میں قاضی صاحب نے ایک استفتاء کا جواب بحث و نظر جلد ج ۵ شمارہ ۱۵ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء میں "الفتاویٰ" کے ذیل میں دیا تھا کہ:

"مسجد کی تعمیر اور بنانے کے وقت اگر بانیان مسجد نے یہ طے کر لیا کہ منصوبہ کے

---

[19] ۔مباحث فقہیہ ص/ ۱۹۰

مطابق نیچے کی منزل کی ضروریات مسجد بیت الخلاء، وضوخانہ، امام ومؤذن کی رہائش گاہ یا مسجد کے انتظامی اخراجات کے لئے دکانیں جو ذریعۂ آمدنی ہوں بنائی جائیں گی اور اوپر کی منزل پر مسجد ہوگی تو ایسا کرنا جائز ہوگا"

جناب احمد سراج مدرسہ ریاض العلوم ہگلی کرناٹک کے ایک استفتاء پر دار الافتاء دار العلوم دیوبند سے ایک فتویٰ اس کے خلاف جاری ہوا، جو میرے حضرت الاستاذ مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی دامت برکاتہم مفتی دار العلوم دیوبند نے تحریر فرمایا تھا، اس پر انہوں نے بحث و نظر میں مطبوعہ فتویٰ کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت مفتی صاحب سے یہ سوال کیا کہ مسجد کے نیچے بیت الخلاء وغیرہ بنانا جائز ہے کہ نہیں؟ اور اسی طرح دکانیں وغیرہ تعمیر کی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ جب کہ اس کی نیت ابتداء سے یہی ہو، مستفتی نے یہ سوال بھی کیا کہ بحث و نظر میں جو فتویٰ شائع ہوا ہے کیا وہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب دامت برکاتہم کا تفرد ہے، یا یہی مفتیٰ بہ قول ہے؟

حضرت مفتی صاحب نے ۳/ شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ کو جو فتویٰ جاری کیا اس میں بحث و نظر کے فتویٰ کو ایک عبارت سے پیدا ہونے والی غلط فہمی پر محمول فرمایا اور مسئلہ یہ بیان فرمایا کہ مسجد کے نیچے کا حصہ اور اوپر کا حصہ دونوں مسجد کے لئے ہونا چاہیئے کسی بندے کا اس کے ساتھ حق متعلق نہیں ہونا چاہیئے، اگر دکانیں ابتداء سے بنوانے کی نیت ہو جب بھی دکانیں بنوانے کے بعد کسی کو کرایہ پر دینا جائز نہ ہوگا بلکہ ان دکانوں میں مسجد کے سامان ہی رکھے جائیں گے الخ۔۔۔۔۔۔۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں حضرت قاضی صاحبؒ کا جواب ہی درست ہے، اور ہمارے حضرت الاستاذ دامت برکاتہم سے فہم عبارت میں ذہول ہوا ہے، اہل علم تحقیق کریں گے تو حقیقت ان پر روشن ہو جائے گی، حضرت قاضی صاحبؒ کو جب مستفتی احمد سراج نے یہ سارا سوال وجواب بھیجا تو قاضی صاحبؒ نے بڑا مفصل اور بصیرت افروز جواب تحریر فرمایا جواب مباحث فقہیہ کی زینت ہے، میں اس بحث کو لاکر مقالہ کو طول دینا نہیں چاہتا، تفصیل کے خواہش مند حضرات اصل کتاب کی طرف رجوع فرمائیں، میں بحث کا صرف وہ حصہ پیش کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق قاضی صاحب کے تفرد کے سوال سے ہے،

مستفتی نے حضرت مفتی صاحب سے یہ سوال کیا تھا کہ کیا یہ قاضی صاحب کا تفرد تو نہیں ہے، اس کا کوئی جواب ہمارے حضرت الاستاذ نے نہیں دیا، اس لئے کہ وہ بھی قاضی صاحب کے آراء کو تفردات کہہ کر نظر انداز کرنا پسند نہیں فرماتے، حضرت مفتی صاحب حضرت قاضی صاحب کی عظمت علمی سے بہت قریب سے واقف ہیں، اس لئے انہوں نے سکوت فرمایا، البتہ قاضی صاحب کے پاس جب یہ سوال پہونچا تو قاضی صاحب نے نہ صرف مسئلہ کی مفصل علمی تحقیق فرمائی بلکہ اس مسئلے میں اپنے تفرد کے بھی ہر احتمال کی مدلل تردید فرمائی، قاضی صاحبؒ کے الفاظ ہیں:

"جملہ حضرات اصحاب افتاء کی ان آراء کے اظہار کا مقصد صرف اتنا ہے کہ یہ حقیر اپنی رائے میں منفرد نہیں ہے، بلکہ ان اکابر علماء واصحاب افتاء حضرت مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ اور حضرت مولانا مفتی سید عبد الرحیم لاجپوریؒ جیسے بزرگوں کا متبع ہے[20]

اسی طرح قاضی صاحبؒ نے ہمیشہ تفردات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا، اور جمہور علماء وفقہاء اور امت کے سواد اعظم کی پیروی میں سلامتی محسوس کی، جبکہ قاضی صاحب جس فقہی ملکہ اوراجتہادی صلاحیت کے مالک تھے، آپ سے عین ممکن تھا کہ ماضی کی بعض عبقری شخصیات کی طرح آپ کے تفردات کی بھی ایک فہرست ہوتی، مگر قاضی صاحبؒ کا تفقہ چونکہ اجتماعی تھا اس لئے ان کے یہاں انفرادیت یا تفرد کا خانہ نہیں تھا، شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ ملے جس میں قاضی صاحب نے سلف سے ہٹ کر اپنی رائے قائم کی ہو۔

ہندوستان کے دار الحرب ہونے اور یہاں سود کے جواز وعدم جواز جیسے حساس مسئلے میں بھی قاضی صاحبؒ نے اپنے سمیناروں اور مقالات میں جو رخ اختیار فرمایا وہ انتہائی محتاط اور اتفاقی تھا یہ قاضی صاحب کی فکری سلامتی اور علمی رسوخ کی علامت ہے۔

---

[20] – مباحث فقہیہ ص ۱۴۵ تا ص ۱۴۹

علمی رواداری کا ماحول

قاضی صاحبؒ کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ اپنی رائے پر نہ کبھی اصرار فرماتے اور نہ اپنی رائے دوسروں پر مسلط فرماتے، علمی بنیادوں پر ہر بات پیش کرنے اور سننے کے قائل تھے، وہ اپنے بزرگوں بلکہ معاصرین کا بھی احترام کرتے تھے، لیکن علمی مسائل میں ٹھوس علمی دلائل کے بغیر کسی رائے کو قبول کرنا خلاف دیانت سمجھتے تھے۔

اپنی رائے کے خلاف سننا، اس کو برداشت کرنا اور سمجھ میں آئے تو اس کو قبول کرلینا اتنا مشکل ترین کام ہے کہ اچھے خاصے تواضع پسند لوگ بھی اس کو صحیح طور پر برت نہیں سکتے، لیکن قاضی صاحب ان اوصاف جلیلہ کا مرقع تھے، وہ نہ صرف اس پر عامل تھے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے، سمینار کے دوران کئی بار حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کا واقعہ سنایا کہ وہ اپنے سے بہت چھوٹے لوگوں کی بھی بات بڑی توجہ سے سماعت فرماتے تھے، یہی علماء اور فقہاء کی شان ہونی چاہیئے، اور جب تک کہ ہم یہ ماحول پیدا نہ کریں گے ایک دوسرے کے علوم و مطالعہ سے استفادہ نہیں کرسکیں گے، قاضی صاحب نے بالکل اسلاف کی تاریخ زندہ کردی۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ علماء سلف کی مختلف آراء پر بہت وسیع نگاہ رکھتے تھے، جن پر ان کی مجلس میں بحث ہوتی تھی، امام مالکؒ اپنی مجلس درس میں زیر بحث مسائل کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں سے امام صاحب کی آراء دریافت کرتے رہتے تھے، امام شافعیؒ فرماتے تھے:

"لایمتنع من الاستماع بمن خالفہ لانہ قد یتنبہ بالاستماع لترک الفعلۃ ویزداد بہ تثبیتا فیما اعتقد من الصواب وعلیہ فی ذلک بلوغ غایۃ جھدہ والانصاف من نفسہ حتی یعرف من این قال وترک ما یترک ولایکون بما قال اغنیٰ منہ بماخالف حتیٰ یعرف فضل مایصیر الیہ علی ما یترک

ان شاء[21]

ترجمہ: اپنے مخالف کی رائے سننے سے گریز نہ کرے ، اس لئے کہ بسا اوقات دوستوں کی رائے سن کر اسے تنبہ ہو گا، اور غلطی سے رجوع کرے گا، اور کبھی اسے اپنی رائے کی صحت کا مزید یقین حاصل ہو جائے گا اور مجتہد کے لئے اس کام میں آخری کوشش تک پہونچنا ضروری ہے، اور خود اپنی ذات سے انصاف کرنا یہاں تک کہ وہ جان لے کہ وہ جو کہہ رہا ہے کہاں سے کہہ رہا ہے اور کس وجہ سے کہہ رہا ہے؟ اور اپنے قول کی وجہ سے وہ مخالفین کی آراء سے بے نیاز نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ وہ اپنی اختیار کردہ رائے کی ترجیح کو متروک پر صحیح سمجھ نہ لے[22]

عصری حالات کی نباضی

قانون اسلامی کا زندگی سے کتنا گہرا رشتہ ہے، اور انقلابات و تغیرات قانونی طور پر زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟ اس کا بڑا گہرا ادراک قاضی صاحب کو تھا، وہ عہد حاضر کی تبدیلیوں اور زندگی کے انقلابات سے بھی واقف تھے، اور شرعی طور پر ان کے کن پہلوؤں پر جواب کی ضرورت ہے، وہ بھی جانتے تھے، وہ بڑی باریک بینی سے حالات کا جائزہ لیتے تھے، خود ایک رائے قائم فرماتے تھے، اور علماء کو بھی ان حالات پر شرعی نقطۂ نظر سے غور کرنے کی دعوت دیتے تھے، اس قسم کے درجنوں مسائل قاضی صاحب کی توجہات کا مرکز بنے، اور ان کی شرعی تشریحات قاضی صاحب نے انفرادی و اجتماعی طور پر پیش فرمائیں، قاضی صاحب نے سمیناروں کے لئے جو سوالنامے مرتب فرمائے وہ ان کی فقہی ذکاوت، فقہ تقدیری کی روح تک رسائی اور عصر حاضر سے ان کی باخبری کی دلیل ہیں، مسئلہ کا تجزیہ فرما کر تمام اجزاء علماء کے سامنے اس طور پر رکھ دیتے تھے کہ علماء کے لئے اس موضوع کا مطالعہ کرنا بھی آسان ہو جاتا تھا اور حکم

---

[21] -الرسالۃ للامام الشافعی ص ۵۱۰

[22] -مباحث فقہیہ ص ۹۵

لگانا بھی مشکل نہ رہتا تھا، سوال کو نصف علم میں نے قاضی صاحب کے سوالنامے سے ہی سمجھا، وہ سوال نامہ کیا ہوتا تھا، تحقیق و اجتہاد کا غیر محسوس درس ہوتا تھا، قاضی صاحب نے اپنے سوال نامہ کے ذریعہ جہاں علماء کو جدید علوم واصطلاحات کی طرف متوجہ کرنے کا کام انجام دیا، وہیں بحث و تحقیق اور مسائل ونوازل کی تحلیل و تجزیہ کا اسلوب دیا، اس کے لئے میں تفصیل میں نہیں جاؤنگا صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں:

دماغی موت وحیات کا مسئلہ

انسان کے دماغی موت وحیات کا مسئلہ آج کی جدید میڈیکل سائنس نے پیدا کیا تو شرعی طور پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوسکتے ہیں؟ اور موت وحیات کے مدارج کے لحاظ سے فقہی احکام کا ترتب کب اور کس طرح ہوگا؟ قاضی صاحب نے ایک مفصل علمی سوالنامہ تیار فرمایا اور اس کو علماء کے سامنے پیش فرمایا، اس کے چند اقتباسات پیش ہیں، ان سے مسئلہ کی اہمیت اور قاضی صاحبؒ کی فقہی حساسیت کا اندازہ لگایئے، تحریر فرماتے ہیں:

> "جدید طبی تحقیقات اور ایجادات نے میڈیکل سائنس کے میدان میں جو انقلاب برپا کیا ہے، اسے انسانی صحت وحیات کے باب میں بڑی کامیابی قرار دیا جانا چاہیئے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان انکشافات اور تحقیقات نے بہت سے ایسے سوالات پیدا کئے، جنہیں فقہاء اسلام نظر انداز نہیں کرسکتے کہ فقہ کا رشتہ زندگی سے استوار ہے اور علم و تحقیق کے نتائج زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ایک فقیہ کی ذمہ داری ہے کہ قواعد شرع کی روشنی میں تعلیمات اسلامی کے ترازو پر تول کر ان نئے اعمال کے احکام متعین کرے جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔۔۔۔
> انسان کیوں مرتا ہے اور کب مرتا ہے، ؟ یہ اصلاً علم طب کا موضوع ہے، لیکن انسانی حیات اور موت کا سوال فقہ اور قانون سے بھی گہرا تعلق رکھتا ہے، کہ زندہ انسان کے لئے علیٰحدہ احکام ہیں، اور مردوں کے لئے علیٰحدہ، موت طاری ہوجانے

کے بعد تجہیز و تکفین، ترکہ کی تقسیم اور دوسرے احکام متعلق ہوتے ہیں جن کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

اس لئے اس وقت کا تعین جب کسی انسان کو مردہ قرار دیا جائے، فقہی نقطۂ نظر سے خاصی اہمیت رکھتا ہے، اور کئی احکام کی تطبیق میں یہ نقطہ مرکز اور مدار کی حیثیت رکھتا ہے، اور موت کے وقت کا تعین اور کسی کو مردہ قرار دینے کے لئے موت کی حقیقت کا تعین ضروری ہے۔۔۔۔

انسانی زندگی جس کے فقدان کا نام موت ہے، اس کی چند صورتیں ہیں:

۱- وہ انسانی زندگی جو بیداری کی حالت میں ہوتی ہے، جس میں احساس، شعور اور حرکت تینوں ہی موجود ہوتے ہیں۔

۲- دوسری قسم جسے حیات جسمانی کہتے ہیں، یعنی نیند کی حالت، جس کے خود کئی درجے ہیں، نیند کا ابتدائی درجہ وہ ہے، جس میں ایک درجہ بیداری بھی پائی جاتی ہے، اور احساس و حرکت بھی، البتہ اگر نیند گہری ہو تو احساس اور حرکت کا بھی فقدان ہو جاتا ہے، اور فوری طور پر انسانی شعور بھی باقی نہیں رہتا۔

۳- تیسری صورت عضوی زندگی ہے، اس سے مراد وہ زندگی ہے جو انسان کی موت کے بعد بھی اس کے بعض اعضاء میں باقی رہتی ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انسانی دماغ تو مر چکا ہوتا ہے لیکن مصنوعی اعضاء کے ذریعہ قلب کی حرکت جاری رکھی جاتی ہے، یہ دراصل بحیثیت فرد انسان کی زندگی نہیں، بلکہ ایک طرح کی جزوی حیات ہے، جو اس کے اعضاء قلب، جگر، گردے وغیرہ میں محدود مدت کے لئے باقی رہ سکتی ہے، اس طرح کہ ان اعضاء کو وہ ساری غذا پہونچائی جاتی رہے جو دوران حیات پہونچائی جاتی تھی۔

۲- چوتھی قسم حیات نسیجی (TISSCOE LIFE) کہلاتی ہے، اس سے مراد

خلیوں کے مجموعے کی ایک خاص نوع زندگی ہے۔

۵-پانچویں قسم جسے حیات خلویہ (CELLULAR LIFE) کہتے ہیں، کسی ایک انسانی خلیے کی خاص نوع کی زندگی، جس کا تجربہ لیبریٹریز (تجربہ گاہوں) میں مطالعہ کے سلسلے میں کیا جاتا ہے، غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کا آغاز حیات خلویہ سے ہوتا ہے، یعنی ایک خلیہ پہلے وجود میں آتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ حیات نسیجی کے مرحلے کو پہنچ جاتا ہے، پھر اس میں اعضاء پیدا ہوتے ہیں، جو حیات عضوی ہے، پھر اس میں روح پھونکی جا تی ہے، اوراس میں حیات جسدی خواب اور بیداری کے مراحل تک پہونچتی ہے اور جب موت آتی ہے تو اس کے بالکل برعکس، پہلے انسان بیداری کی مکمل زندگی سے محروم ہوتا ہے پھر عضوی زندگی اور اس کے بعد نسیجی زندگی ختم ہوتی ہے، اور آخر ش حیات خلویہ تک جا پہونچتا ہے۔۔۔۔

کتاب وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخ روح سے انسان میں زندگی آتی ہے اور روح کا بدن سے جدا ہو جانا انسان کی موت ہے،۔۔۔۔روح کا جو کچھ عمل بتایا جاتا ہے اپنے آثار کے اعتبار سے وہی عمل ہے جو جذع دماغ (stem brain) کا آج کے اطباء بتاتے ہیں پس یوں کہاں جاسکتا ہے کہ روح کا بدن سے جدا ہو جانا یہ نتیجہ پیدا کرتا ہے کہ اعضاء جسم انسانی دماغ کے تابع باقی نہیں رہتے۔۔۔۔۔۔۔۔

اطباء اور فقہاء کے مابین اصل بحث کا میدان موت کے عام واقعات نہیں ۔۔۔۔۔بلکہ وہ خاص صورتیں ہیں جب کہ مریض کو مصنوعی آلات کے ذریعہ زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے جو مریض ان مصنوعی آلات کے تحت رکھا جاتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مریض کی سانس کی آمد ورفت اور قلب کی دھڑکن اپنی طبعی حالت کی طرف لوٹ جاتی ہے ایسی حالت میں ان مصنوعی آلات کو ہٹالیا جاتا

ہے، دوسری صورت وہ ہوتی ہے جس میں قلب کی حرکت اور سانس کی آمد ورفت قطعی طور پر بند ہو جاتی ہے اور وہ مصنوعی آلات کے ذریعہ بھی حرکت میں نہیں آتے ایسے حالات میں مریض کی موت کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ یہاں دل و دماغ دونوں ہی مر چکے ہوتے ہیں اور اس صورت میں مصنوعی آلات کو باقی رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔

تیسری صورت وہ ہے جس میں اس مریض میں وہ علامتیں ظاہر ہو گئی ہیں جو دماغ کی موت کی دلیل تسلیم کی جاتی ہے، مثلاً مکمل بے ہوشی، حرکت کا فقدان، اور طبی آلات کے ذریعہ اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ دماغ میں کوئی برقی رو اور لہر موجود نہیں، ایسی صورت میں اگرچہ دماغ مر چکا ہوتا ہے، لیکن آلات کے ذریعہ اس کی سانس اور دل کی دھڑکن جاری رکھی جاتی ہے، اور یقین ہے کہ جیسے ہی آلات ہٹائے جائیں گے دل کی دھڑکن رک جائے گی اور سانس بند ہو جائے گی۔

ایسی صورت میں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔

۱- کیا اس حالت میں ان آلات کا ہٹالینا جائز ہو گا؟

۲- موت کے احکام مثلاً وراثت، اجرائے وصیت، عورت کے حق میں عدت کب سے جاری ہونگے، جب دماغ مرا اس وقت سے، یا جب آلات ہٹا دیئے گئے اور حرکت قلب بند ہو گئی اس وقت سے؟۔۔۔ آخری صورت ۔۔۔ جس میں مصنوعی آلات اور مشینوں کے ذریعہ سانس کی آمد ورفت باقی رکھی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ ایک تکلف اور مصنوعی حیات ہے، جس کی بقا کے لئے مشینیں لگا کر سانس کی آمد ورفت قائم رکھنے کو شرعاً ضروری نہیں کہا جا سکتا، اس لئے ایسی مشینوں کو ہٹالینا جائز ہو گا[23]

---

[23]- مباحث فقہیہ ۳۶۹ تا ۴۰۲

افسوس کہ موت وحیات کے یہ فلسفیانہ اور فقہیانہ حقائق بیان کرنے والا خود موت وحیات کی مذکورہ کشمکش سے گذر کر اب ہم سے بہت دور جا چکا ہے، اب آنکھیں ایسا فقیہ، قاضی، مفکر اور داعی انقلاب دیکھنے کے لئے ترس جائیں گی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستاں اس گھر کی نگہبانی کرے [24]

---

[24] – تحریر بمقام دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد شب ۲۸/ اپریل ۲۰۰۲ء سنیچر

مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے

۴/ اپریل ۲۰۰۲ء کو بعد نماز مغرب فقیہ العصر قاضی القضاۃ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے وصال کی خبر بجلی بن کر گری اور میرے وجود میں اترتی چلی گئی،، ایسا لگا جیسے یہ قاضی صاحب کی نہیں، میری موت ہو، ایک سکتہ کی کیفیت طاری ہو گئی، ارد گرد تاریک ہو کر رہ گیا، ایسا محسوس ہوا جیسے آج کے دن سورج کے ساتھ علم وکمال کا نیر تاباں بھی ڈوب گیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

قریب نصف صدی تک جس شخص نے اپنے علم وفن سے قوم وملت اور دنیائے علم کو مالا مال کیا ، جس کے ایثار ووفا اور صدق واخلاص کی تاریخ کئی دہائیوں تک ثبت ہوتی رہی، جس کے عزم واستقلال نے ملک وقوم کو ایک خوشگوار علمی انقلاب دیا، جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم اور علماء اور ملت اسلامیہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور جس نے زندگی کے آخری لمحے تک اپنے کام اور کاز کو فراموش نہیں کیا ایسی ہستی کا اچانک ہم سے رخصت ہو جانا کوئی معمولی حادثہ نہیں، تاریخ ایسے محسن کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

وہ گئے اور اپنا بدل چھوڑ کر نہیں گئے

لوگ جاتے ہیں اور اپنا بدل چھوڑ جاتے ہیں، نعم البدل نہ سہی، مگر ان کا کام کرنے والے متبادل افراد موجود ہوتے ہیں، ان کے جانے سے انجمن نہیں اجڑ جاتی، اور ان کے نگاہ موڑ لینے سے چمن کی شادابی نہیں چلی جاتی، مگر کم لوگ ہوتے ہیں جو جاتے ہیں اور اپنا کوئی متبادل نہیں چھوڑتے، یعنی ان کے بعد کوئی ایسا نہیں ہوتا جو اس کے عظیم کاموں کا بار اٹھا سکے، اور ان کے بعد ان کی جگہ لے سکے، تاریخ میں ایسے افراد کی فہرست بنائی جائے تو گنتی کے چند لوگ ہونگے جن کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ "وہ گئے اور اپنا بدل چھوڑ کر نہیں گئے"۔

ہمارے قاضی صاحب انہی گنتی کے چند عبقری لوگوں میں تھے، جو دنیا میں تھے تو مجلسیں بھر

پور، انجمن آباد اور لالہ وگل پر بہار لگتے تھے، اور احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے نہ ہونے سے کیا ہو جائے گا؟ لیکن اب جب وہ دنیا سے چلے گئے تو دنیا ہی تاریک ہو گئی، چمن ہی اجڑ گئے، محفلیں سونی پڑ گئیں، کہاں ہزاروں قمریاں نغمہ سرا تھیں، اس ایک بلبل کے چلے جانے سے ساری قمریاں ہی اڑ گئیں، ان کے بعد محفل میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ان کے کام کو اسی شان کے ساتھ آگے بڑھا سکے، اور ان کی جگہ لے سکے، اور جو ان جیسی جامعیت رکھے، "اناللہ وانا الیہ راجعون"

یہی ہے عالمی موت، اور اسی کا نام ہے حسرت عالم، اور بقول میر تقی میرؔ:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو آئے ہیں سبھی دنیا میں مرنے کے لئے

معصوم بچپن کی محبت

میں قاضی صاحبؒ کے نام سے پہلی بار اس وقت آشنا ہوا، جب میں نے ہوش کی آنکھیں بھی نہیں کھولی تھیں، میں اس نام سے کافی محبت کرتا تھا، اس لئے کہ اس نام کے ساتھ میری بعض خوشیاں وابستہ تھیں، عید کی خوشیاں کسے عزیز نہیں، مگر بچوں کے لئے اس کی نوعیت ہی الگ ہوتی ہے، عید کا انتظار جتنا بچوں کو ہوتا ہے شاید روزہ داروں کو بھی نہیں ہوتا، ہمارے علاقہ میں امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کے بڑے اچھے اثرات ہیں، رمضان اور عیدین کے موقعوں پر اگر چاند نظر نہیں آتا تو لوگوں کو امارت شرعیہ کی طرف سے اعلان کا شدید انتظار ہوتا ہے، شام کو ساڑھے سات بجے لوگ ریڈیو لے کر بیٹھ جاتے تھے، شام کی ریاستی خبروں کے آخر میں امارت شرعیہ کے قاضی القضاۃ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ کے حوالہ سے رویت ہلال کی خبر نشر کی جاتی تھی، لوگ اس کو بہت ہی شوق سے سنتے تھے، اس طرح حضرت قاضی صاحبؒ ہمارے بچپن میں "چاند والے مولانا" تھے۔

میری علمی زندگی کے لئے ہلال عید

کیا خبر تھی کہ وہ میری علمی زندگی کے لئے بھی "ہلال عید" ثابت ہونگے اور اس چاند کے ڈوب جانے پر مجھے عرصہ تک رونا پڑے گا۔

۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۹ء میں جب میں دار العلوم دیوبند میں معین مدرس تھا، ایک دن فقہی، تحقیقی دستاویزی سہ ماہی مجلہ "بحث و نظر" کا اشتہار دار العلوم کی دیواروں پر چپکا ہوا نظر آیا، حیرت ہوئی، علمی ادبی زوال کے اس دور میں جب لوگ عام فہم اور دلچسپ اردو رسائل بھی خرید کر پڑھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اور ان رسائل کے ذمہ دار ان اشاعت کی کمی کا رونا روتے ہیں، بد ذوقی اور قحط کے اس دور میں تحقیقی اور دستاویزی مجلہ کون پڑھے گا؟ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے رسالہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آگیا اور پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ علمی دنیا میں ایک قیمتی اضافہ ہوا ہے، یہ میرا پہلا علمی تعارف تھا مدیر رسالہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ سے، اس رسالہ کے فقہی مباحث، زاویۂ نگاہ، اصولی اور تجزیاتی انداز تحریر، مذاہب فقہیہ کے تحقیقی مطالعہ، القضایا، الفتاویٰ اور نئی علمی کتابوں کے تعارف و تبصرہ وغیرہ نے میرے فقہی مطالعہ کو ایک نئی سمت عطا کی، اگرچہ میں افتاء کے کورس سے فارغ ہو چکا تھا، لیکن اس نئی روشنی میں پھر سے فقہی سفر شروع کیا، مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اب تک جو کچھ پڑھا ہے وہ محض رسمی ہے، حقیقی اور گہری تعلیم کے لئے مجھے پھر سے محنت کرنی ہوگی، چنانچہ زمانۂ تدریس میں قاضی صاحبؒ کی غائبانہ سرپرستی میں میں نے رسم سے حقیقت کی طرف، اور سطحیت سے تعمق کی طرف ایک نئے علمی سفر کا آغاز کیا، اور اس طرح قاضی صاحبؒ میرے معنوی معلم اور میں ان کا غائبانہ متعلم بنا۔

رسالہ بحث و نظر کا تعمیری کردار

کوئی میرے دل سے پوچھے کہ "بحث و نظر" نے ایک طالبعلم کو حقیقی طالبعلم بننے میں کیا کردار ادا کیا؟ اور ایک غافل اور کاہل شخص کو علم و تحقیق کی راہ پر کیسے ڈالدیا؟ کسی علمی رسالے کی اس سے بڑی افادیت کیا ہو سکتی ہے؟ سچی بات یہ ہے کہ قاضی صاحبؒ کی علمی انقلابی تحریک کا با قاعدہ آغاز اسی رسالہ

سے ہوا،، اس سے قبل بحیثیت قاضی شریعت، فقیہ عصر، مفکر وقت، اور مجاہد ملت ان کے جو بھی کارنامے تھے، ان کی افادیت کا دائرہ محدود تھا، "بحث و نظر" نے پہلی بار قاضی صاحبؒ کے فکر و فن اور ان کی فقہی بصیرت کو عام کرنے کا عمل شروع کیا، اور اسی رسالہ کے ذریعہ قاضی صاحبؒ نے ایک عہد اور ایک نسل کی تعلیم و تربیت اور فکری تشکیل کا آغاز کیا، انہوں نے علماء اور طلبہ کے دلوں میں طلب و جستجو کی آگ بھڑکادی، ان کو ایک سمت سفر دیا، علم و تحقیق کا سلیقہ دیا،، بہت سی وہ کتابیں جن کے نام سے بھی طلبہ و فضلاء واقف نہیں تھے، یا تو وہ کتابیں میسر نہیں تھیں یا بڑی لائبریریوں کے نمائش خانوں میں محفوظ تھیں ، کئی دہائیوں سے کسی نے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا، قاضی صاحبؒ نے ان کتابوں پر جمی گرد کو صاف کیا، ان کے نام اور مقام سے علماء کو واقف کرایا، اور محنت و مطالعہ سے بھاگنے والی جماعت کو کتابوں سے قریب کیا، یہ وہ زبردست علمی انقلاب تھا جو شاید نصف صدی کے بعد پہلی بار اس مرد مجاہد کے ذریعہ رونما ہوا۔

اس موقعہ پر میں اپنے علمی مربی، عظیم ترین محسن اور مشفق استاذ حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی مفتی دار العلوم دیوبند (نور اللہ مرقدہ) مرتب فتاویٰ دار العلوم دیوبند وصاحب تصانیف کثیرہ) کا بہت زیادہ ممنون ہوں کہ حضرت مفتی صاحبؒ ہی نے پہلی بار مجھے " بحث و نظر" سے روشناس کرایا، مفتی صاحبؒ کے پاس یہ رسالہ اعزازی طور پر آتا تھا، مفتی صاحب نے مجھے یہ رسالہ دکھاتے ہوئے فرمایا کہ "یہ بڑا علمی رسالہ ہے اس کو پڑھو اور محنت کر کے اس کے معیار کا کوئی مضمون تیار کرو، میں قاضی جی کو اشاعت کے لئے بھیج دونگا" کوئی نہیں جانتا کہ کس کی زبان سے کون سا جملہ کس پر کب اثر انداز ہو گا؟ میں نے حضرت الاستاذ کو کوئی جواب تو نہیں دیا مگر دل میں ایک کسک پیدا ہوئی کہ کاش میں بھی اس لائق ہوتا، اور پھر میرے اس علمی سفر کا آغاز ہوا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا، وہ سفر آج تک جاری ہے اور اللہ کرے کہ زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہے، اللھم آمین۔

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) ایک عظیم علمی تحریک

اسی اثنا معلوم ہوا کہ قاضی صاحبؒ نے ایک فقہی انجمن قائم کی ہے، جس کا پہلا نام "مرکز البحث العلمی" تھا اور بعد میں "مجمع الفقہ الاسلامی" (اسلامک فقہ اکیڈمی) کے نام سے مشہور اور متعارف ہوا،

یہ فقہی میدان میں قاضی صاحبؒ کا دوسرا بڑا انقلابی قدم تھا، یعنی تحریری تعلیم کے ساتھ زبانی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہوا، اور اس طرح قاضی صاحب کی کوششوں سے آزاد ہندوستان میں پہلی بار فقہ شورائی یا فقہ اجتماعی کی بنیاد پڑی۔

اجتماعی اجتہاد

اور یہ کوئی نئی بدعت قاضی صاحبؒ نے ایجاد نہیں کر دی تھی، بلکہ یہ سنت فاروقی ہے کہ اہم مسائل میں انفرادی آراء کے بجائے اجتماعی غور وخوض کا راستہ اختیار کیا جائے، متعدد مسائل میں حضرت فاروق اعظمؓ نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا۔۔۔۔۔

اس طرز اجتہاد کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انفرادی آراء میں جو اختلافات ہو سکتے ہیں ان کا امکان اس صورت میں بہت کم ہو جاتا ہے، اور زیادہ تر مسائل میں کوئی متفقہ قدر نکل ہی جاتی ہے، علاوہ ازیں بحث کے مختلف پہلو تمام لوگوں کے سامنے آجاتے ہیں اور ہر پہلو پر سنجیدگی کے ساتھ شرکاء کو سوچنے کا موقعہ ملتا ہے، نیز اس سے نئے شرکاء اور فضلاء کی ذہنی تربیت بھی ہوتی ہے، اور ان میں نئے مسائل کے حل کا شعور پیدا ہوتا ہے، اور اس طرح امت میں علمی خلا پیدا نہیں ہوتا۔

اس طرز اجتہاد کا ایک اہم ترین فائدہ یہ بھی ہے کہ امت میں جزوی اجتہاد کا عمل جاری رہتا ہے، اس کے ذریعہ ہر دور میں نئے مسائل وحوادث کا حل نکالا جاسکتا ہے، اور اسلامی قانون کی جامعیت اور ابدیت کے مظاہر سامنے آتے رہتے ہیں، اور قانون ہر دور میں اپنی نئی تعمیر وتشریح کے ساتھ زندگی پر حاوی رہتا ہے وغیرہ۔

یہ وہ عظیم مقاصد ہیں جن کے پیش نظر ایک حدیث پاک میں خود سرکار دوعالم ﷺ نے شورائی اجتہاد کی ہدایت فرمائی تھی، اور اسلامی تاریخ میں اس کا آغاز سب سے پہلے حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا، اور پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے بھی اجتماعی اجتہاد کے اس سلسلے کو آگے بڑھایا بلکہ اس کو باقاعدگی بخشی، حضرت فاروق اعظمؓ کے اکثر مسائل اجماعی یا اتفاقی ہوتے، ان کے مذہب فقہی کی اشاعت کا بڑا سبب یہی اجتماعی طرز اجتہاد ہے، حضرت فاروق اعظمؓ کے علاوہ دیگر فقہاء صحابہ کو یہ مواقع حاصل

نہیں ہوئے، اس لئے ان کے مذاہب کو وہ قبول عام حاصل نہیں ہوا اور نہ ان کی وہ اشاعت ہو سکی جو حضرت فاروق اعظمؓ کے مذہب فقہی کی ہوئی[25] حضرت فاروق اعظمؓ کی فقہ اجتماعی تھی، اور دیگر صحابہ کی فقہ انفرادی، انفرادی اور اجتماعی کا فرق صحت فکر میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور قبولیت واشاعت میں بھی۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی اجتماعی فقہ

حضرت فاروق اعظمؓ کے بعد سے امام اعظم ابو حنیفہؒ تک اجتماعی فقہ کی کسی بڑی کوشش کا کوئی سراغ نہیں ملتا، تابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور میں امام اعظم ابو حنیفہؒ نے ایک بار پھر اس تاریخ کا اعادہ فرمایا، البتہ صورت حال تھوڑی بدلی ہوئی تھی کہ امام اعظمؒ نے اتنا اہم ترین کام سرکاری سطح پر نہیں بلکہ نجی سطح پر شروع فرمایا، اس لئے کہ سرکاری طور پر اس عظیم الشان کام کی تکمیل ناممکن تھی، کیونکہ اب نہ فاروق اعظمؓ جیسے امیر المؤمنین تھے اور نہ ان کے شرکاء مجلس کی طرح اہل کمال شرکاء۔۔۔ امام ابو حنیفہؒ نے بہت دور رس منصوبہ بندی کے ساتھ فقہ تقدیری کی بنیاد ڈالی، اور نئے مسائل کے علاوہ مستقبل قریب سے مستقبل بعید تک کے ممکنہ مسائل کو بحث و نظر کا موضوع بنایا اور اس طرح ایک قابل لحاظ عرصے کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں ہزاروں بلکہ لاکھوں مسائل اسلامی قانون کی حیثیت سے مدون کر لئے گئے

ائمہ اربعہ میں کسی امام کے مذہب کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہے، امام ابو حنیفہؒ کی فقہ اجتماعی تھی، اور ان کے علاوہ تینوں ائمہ کی فقہ انفرادی، اسی لئے امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کو جو قبول عام اور عقل و نقل کی ہم آہنگی حاصل ہوئی وہ کسی امام کے مذہب کو حاصل نہ ہو سکی۔

یہ اجتماعی اور انفرادی کا فرق ان ائمہ کے اصول اجتہاد میں بھی ملتا ہے، یہ ائمہ اربعہ کے اصول اجتہاد کے تجزیہ کا موقع نہیں ہے ورنہ اس پر روشنی ڈالی جاتی کہ امام ابو حنیفہؒ نے اجتہاد و تفقہ کے جو اصول اختیار فرمائے وہ آفاقیت کے حامل ہیں، اور ان میں کسی مخصوص طرز یا علاقے کی تحدید یا تخصیص نہیں ہے، جبکہ دیگر ائمہ کے اصول اجتہاد میں اس قسم کی تخصیصات و تحدیدات کئی جگہ نظر آتی ہیں، مثلاً امام مالکؒ

---

[25] – ازالۃ الخفاء حضرت شاہ ولی اللہ ج ۳

نے اختلافی مسائل میں ترجیح کا یہ اصول اختیار فرمایا ہے کہ اہل مدینہ کے اقوال کو ترجیح حاصل ہو گی، یہ علاقائی تخصیص ہے، حضرت امام شافعیؒ نے اصح مافی الباب (یعنی موضوع پر سند اًسب سے صحیح ترین روایت) کو ترجیح کی بنیاد قرار دیا ہے، اور یہ روایت اور درایت میں سے روایت کی تخصیص ہے، امام اعظم ابو حنیفہؒ کے اصولوں میں اس قسم کی کوئی حد بندی یا تنگی نہیں ہے، نہ ان کے یہاں علاقائی ترجیح ہے اور نہ محض قوت سند کو معیار مانا جاتا ہے، وہ ہر علاقے کی صحیح روایات کا اعتبار کرتے ہیں اور روایت و درایت دونوں اصولوں کو مناسب طور پر استعمال کرتے ہیں یہ آفاقیت بلاشبہ اجتماعی اجتہاد کی دین ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فقہ اجتماعی کو آخری شکل دی، اور اس طرح بحث و نظر کے بے شمار گوشے اور اجتہاد واستنباط کے متعدد اصول سامنے آئے، بعد میں امام ابو یوسفؒ، امام شافعیؒ اور دیگر فقہاء میں اصول فقہ کی تدوین کا جو رجحان پایا جاتا ہے، کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب اسی مجلس ابو حنیفہؒ کی دین تھی، اسی لئے اگر چیکہ امام ابو حنیفہؒ نے اصول فقہ پر خود کوئی کتاب نہیں لکھی اور نہ باقاعدہ اس کی تدوین کی طرف توجہ فرمائی، مگر انہوں نے اپنی فقہی مجلسوں کے ذریعہ بحث و تحقیق، اور اجتہاد واستنباط کے جو مناہج اور اصول پیش کئے وہ بعد کے ادوار میں تدوین اصول کے لئے دلیل اور اساس بنے، اس طرح اصول فقہ کی تدوین یا اصول اجتہاد کی نشو ونما سے امام ابو حنیفہؒ کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔

جمود وانحطاط کا آغاز

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے بعد مختلف علاقوں اور ادوار میں حسب ضرورت جزوی طور پر امام صاحبؒ کے اس اجتماعی طرز کی پیروی کی گئی، اور علماء محدود سطح پر نوازل وحوادث (نئے مسائل وواقعات)میں اجتماعی غور وفکر کے لئے بیٹھتے رہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ ذوق جستجو اور جذبۂ تحقیق کمزور پڑتا چلا گیا اور فی الجملہ ایک جمود اور استغناء کا ماحول بن گیا، علماء کے اندر بالعموم تصلب کی جگہ تعصب، وسعت کی جگہ تنگ نظری اور دقت نظری اور حساسیت کی جگہ سطحیت اور جذباتیت نے لے لی، درمیانی صدیوں میں کئی اہل تحقیق اور انقلابی علماء نے اپنے اپنے طور پر اس جمود کو توڑنے اور اس بحر ساکن میں حرکت لانے کی کوشش کی، جس میں امام غزالیؒ، علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ عزالدین بن عبد السلامؒ، علامہ ابن ہمامؒ، علامہ ابن دقیق

العیدؒ اور علامہ زین الدین قاسم بن قطلوبغاؒ اور قریب ترین صدیوں میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حضرت مولانا ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلیؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام زیادہ نمایاں ہیں، ان حضرات کی علمی اور انقلابی کوششوں کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور اس طرح ہر دور میں اہل علم اور اہل تحقیق علماء پیدا ہوتے رہے۔

مگر اس پورے دور میں کم از کم ہندوستان میں جدید علمی مسائل اور نوازل وحوادث کے حل کے لئے کسی بڑی اجتماعی کوشش کا سراغ نہیں ملتا، حضرت عالمگیرؒ کے دور میں علامہ نظامؒ کی سربراہی میں ایک مجلس فقہی قائم ہوئی تھی، جس نے مشہور زمانہ کتاب "فتاویٰ ہندیہ" مرتب کی، مگر اس کی حیثیت اجتہادی نہیں تھی، نئے مسائل پر غور وخوض کرنا اس کے مقاصد میں شامل نہیں تھا، اس مجلس کا کام فقط اتنا تھا کہ ہندوستانی حالات کے تناظر میں فقہ حنفی کی مکمل جزئیات کو موضوعاتی طور پر مرتب کر دیا جائے، یعنی بالفاظ دیگر اس مجلس کے قیام کا مقصد ہندوستان کے اسلامی تحریری آئین کی ترتیب نو تھی، یہ بھی اپنی جگہ ایک اہم ترین کام تھا، مگر اس کا تعلق زیادہ تر عدالتی نظام سے تھا، "اجتماعی تفقہ وتدبر" کا کام اس مجلس کے موضوع سے خارج تھا۔

اسی طرح ترکی کی خلافت عثمانیہ کے دور میں "مجلۃ الاحکام العدلیہ" اور ہندوستان کے عہد اسلامی میں ایک اور مجموعۂ قانون "فتاویٰ تاتار خانیہ" کی ترتیب عمل میں آئی، مگر ظاہر ہے کہ ان سب کا تعلق اسلامی حکومت کے آئینی یا عدالتی نظام سے تھا، اس کا عمل تشریع یا اجتماعی اجتہاد سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔

البتہ آخری دور میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس میدان میں اہم کردار ادا کیا،، اور انہوں نے متعدد نئے مسائل پر مخصوص علماء کو اجتماعی غور وفکر کی دعوت دی، جس کے اہم ارکان میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ بھی تھے، انہوں نے اس چیز کو محدود سطح پر کچھ دنوں پاکستان میں بھی جاری رکھا۔

اسی قسم کی ایک محدود کوشش حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور حضرت مولانا منظور احمد نعمانیؒ کی فکر و عمل سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھی کی گئی تھی، جس کے تحت ملک کے اہم ترین علماء نے وقت کے کئی اہم مسائل پر بحث و تحقیق کی، اور ان کا حل نکالنے کی سعی جمیل فرمائی۔

ایک بہت چھوٹی سطح پر حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ کے زمانہ میں جمعیۃ علماء ہند نے بھی اس میدان میں کوشش کی تھی۔

ان تمام فقہی کوششوں کی علمی اور تاریخ طور پر اپنی اہمیت ہے ۔۔۔ مگر یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ اس میدان میں کوئی بہت زیادہ بڑی کوشش نہیں کی گئی، حسب ضرورت چند علماء کی چند نشستوں میں مسائل پر تبادلۂ خیال کر لیا گیا اور بس۔

قاضی صاحب کا انقلابی کارنامہ

اس میدان میں عام انقلابی سطح کی کوشش برصغیر میں پہلی بار حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے کی، انہوں نے اس "اجتماعی تفقہ" کو اس دور کے ہر عالم کا مسئلہ بنادیا، ہر مفتی کے دل میں آگے بڑھ کر امت کے مسائل کی فکر پیدا کی، اور ان کو مجبور کیا کہ وہ کتابوں کا مطالعہ کریں، فکر و نظر میں وسعت پیدا کریں، فقہ اسلامی کے اصل سرچشموں سے براہ راست مربوط ہوں، فقہ اسلامی کے اصول وکلیات سے آگاہ ہوں، دین کا مزاج سمجھیں، حالات پر نگاہ رکھیں، جدید علوم واصطلاحات کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں اور تغیر پذیر دنیا میں آنکھ اور کان بند کر کے نہیں بلکہ پوری بیداری اور حاضر دماغی کے ساتھ مسائل کا سامنا کریں، اس طرح اسلامک فقہ اکیڈمی ایک طرف جدید مسائل کے حل کے لئے علماء کے اجتماعی تفکر و تفقہ کا مرکز بنی تو دوسری طرف جدید علماء اور فضلاء کے لئے فقہی اور علمی تربیت گاہ بھی۔

تاریخ ساز فقہی سمیناروں کا آغاز

دیوبند کے دوران قیام جب مجھے معلوم ہوا کہ "اسلامک فقہ اکیڈمی" کے نام سے دلی میں فقہاء

وعلماء کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے، تو دفعۃً میرا ذہن امام اعظم ابو حنیفہؒ کی مجلس فقہی کی طرف گیا لیکن اس مجلس کے معیار بحث و تحقیق اور اسلوب گفتگو وغیرہ کا قطعاً اندازہ نہیں تھا، اس اکیڈمی کا پہلا فقہی سمینار جامعہ ہمدرد دہلی میں بڑے آب و تاب کے ساتھ ہوا، یہ آزادی کے بعد ہندوستان میں علماء کا اس معیار کا پہلا اجلاس تھا، جس میں عہد حاضر کے جدید ترین اسباب ووسائل سے استفادہ کیا گیا، اور بحث و تحقیق اور تبادلۂ خیالات کا معیار بھی انتہائی اعلیٰ، سنجیدہ اور باوقار اختیار کیا گیا، ملک اور بیرون ملک کے چوٹی کے علماء، فقہاء اور مسلم ماہرین کی شرکت نے اس سمینار کو اپنی نوعیت کا پہلا سمینار ثابت کیا، میں اس پروگرام میں شریک نہ ہو سکا تھا، لیکن اس کی ہمہ گیر شہرت نے اس پروگرام کے دیکھنے اور سننے کی طالبعلمانہ آرزو پیدا کر دی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد ہی یہ معلوم ہوا کہ اکیڈمی کا دوسرا سمینار اسی مقام پر پھر ہونے جارہا ہے اس کی خبر حضرت الاستاذ مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحبؒ کے ذریعہ ملی، جن سے میرے علمی استفادہ کا سلسلہ برابر جاری تھا، اسی استفادہ کی ایک کڑی کے طور پر حضرت مفتی صاحبؒ نے مجھے سمینار کا سوالنامہ مرحمت فرمایا اور مجھے اس پر تحقیق کرنے کا حکم دیا، سوالنامہ عہد حاضر کے جدید ترین موضوع "کرنسی نوٹ" سے متعلق تھا، میرے لئے یہ موضوع قطعی اجنبی تھا، اس کی ابتدائی معلومات بھی مجھے حاصل نہ تھی، مگر حضرت الاستاذؒ کے حکم کے سامنے میں نے سر تسلیم خم کر دیا اور پھر یہ آرزو بھی تھی کہ دلی دیوبند سے بہت زیادہ دور بھی نہیں ہے اس پروگرام میں شرکت کے لئے موضوع سے کچھ مناسبت تو ضرور ہونی چاہئے۔

میں نے موضوع سے متعلق ضروری تیاری کر کے متعلقہ مواد حضرت الاستاذؒ کی خدمت میں پیش کیا تو مفتی صاحب نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور حوصلہ افزائی کے کلمات ارشاد فرمائے، میں نے حوصلہ پاکر حاصل شدہ مواد کی روشنی میں ایک مختصر سا مقالہ تیار کر لیا، جو میرا پہلا فقہی مقالہ تھا، یہ مقالہ میں نے بذریعہ ڈاک اکیڈمی کو بھیجدیا جو بعد میں بحمد اللہ مجلہ فقہ اسلامی کی اشاعت میں شامل ہوا۔

سمینار کی تاریخ قریب آئی تو حضرت الاستاذ مفتی صاحبؒ نے بطور خود مجھے اپنے خادم کی حیثیت سے چلنے کا مژدہ سنایا، میں تو ان کا سراپا خادم تھا ہی، میں نے اس موقعہ کو اپنی سعادت خیال کیا اور بخوشی تیار

ہو گیا۔

قاضی صاحبؒ سے پہلی ملاقات

یہ اس عظیم الشان فقہی سمینار میں میری پہلی شرکت تھی اور پہلی بار میں نے حضرت قاضی صاحبؒ کو مشاہدہ کی آنکھوں سے دیکھا اب تک میں نے مطالعہ اور تصور کی نگاہ سے ان کی جو صورت خیالیہ تیار کی تھی قاضی صاحبؒ کا ظاہری سراپا قطعی اس سے مختلف تھا، میرے ذہن میں کسی علمی سرتاج یا نستعلیقی شخصیت کی تصویر تھی، اور میرے سامنے جو شخصیت تھی وہ ایک مرد درویش تھا، جو اس جدید ترین سہولیات کے ماحول میں ہر طرح کے تکلف و تصنع سے بالاتر اور سادگی و مسکنت کا مرقع تھا۔۔۔۔۔ لیکن جب مختلف نشستوں میں ان کی تقریریں سنیں اور مسائل کا تجزیہ اور اصول وکلیات کی تحلیل کرتے ہوئے دیکھا تو میں نے یقین کیا کہ انسان کی عظمت اس کے فکر و فن اور کارناموں سے ہے، ظاہری ٹیپ ٹاپ سے نہیں۔

میں نے دیکھا کہ اس چوٹی کانفرنس میں (جس میں دار العلوم دیوبند کے اکابر اساتذہ اور مفتیان کرام بھی شریک تھے، علاوہ پورے ملک اور عالم اسلام کی بلند ترین شخصیات موجود تھیں) وہ پوری بصیرت اور اعتماد کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے، سارا مجمع ہمہ تن گوش تھا، اور فکر و فن کے سینکڑوں شہ پارے لفظوں کے وسیلے سے تقسیم ہو رہے تھے۔۔۔۔ میں نے خالص علمی ماحول کا یہ منظر پہلی بار دیکھا تو اب تک جو کچھ پڑھا تھا، ہوا ہوتا ہوا نظر آیا، میں نے اپنے آپ کو ہزار بار کوسا کہ

اسی روز و شب میں الجھ کے نہ رہ جا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

سمینار کے اکثر شرکاء پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے اور معلومات کا بڑا ذخیرہ ساتھ لائے تھے، بحث کرتے ہوئے وہ معاشیات کے انتہائی باریک نکتوں تک پہونچتے تو ماہرین معاشیات بھی انگشت بدنداں رہ جاتے، لیکن ان وقیع اور انتہائی سنجیدہ مباحث کے بیچ جب قاضی صاحبؒ کی آواز گونجتی اور کسی خاص

مناسبت سے ان کو گفتگو کی ضرورت پیش آتی تو موضوع اور اس سے متعلق ہونے والی بحثوں کا ایسا تجزیہ پیش فرماتے کہ رواں رواں سرشار ہو جاتا اور زبان پر بے ساختہ میرؔ کا یہ شعر آجاتا:

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

میں نے دلی سے واپسی پر اپنے قلبی تأثرات ومشاہدات قلمبند کئے جو "کارواں اور غبار کارواں" کے نام سے دار العلوم دیوبند کے پندرہ روزہ رسالہ "آئینۂ دارالعلوم" میں شائع ہوئے (اب یہ رسالہ بند ہو چکا ہے)

اس کے بعد میں قاضی صاحب کے اکثر سمیناروں میں طالبعلمانہ حیثیت سے شریک رہا، متعلقہ موضوعات پر تحریرات بھی تیار کیں، اور مسئلہ کو سمجھنے کے لئے بحث میں بھی حصہ لیا، حضرت قاضی صاحبؒ کے حکم پر متعدد مرتبہ "عارض مسئلہ" کی حیثیت سے بھی خدمت انجام دی، میں نے ان سمیناروں ،ان کی عمومی اور خصوصی نشستوں اور قاضی صاحبؒ کی عام وخاص مجلسوں کو بہت قریب سے دیکھا، ان کے اسلوب تحقیق سے متأثر ہوا، اس کی تقلید کی کسی درجہ میں کوشش کی، بحث وتنقیح کا جذبہ پیدا ہوا اور اس طرح متعدد فقہی موضوعات پر لکھنے کی توفیق میسر ہوئی (اب میرے ان فقہی مقالات کا منتخب مجموعہ "نوازل الفقہ" کے نام سے چھ (٦) جلدوں میں سال رواں ہند وپاک دونوں جگہ شائع ہو چکا ہے)

قاضی صاحبؒ ایک مرد انقلاب تھے

غرض قاضی صاحب نے پوری جدید نسل بالخصوص طبقۂ علماء کو بہت متأثر کیا، ان میں اس اکیڈمی کے ذریعہ تعمیری انقلاب کی روح پھونکی، جوانوں میں انقلابی روح بیدار کی، ان کو ان کی حیثیتوں کا عرفان کرایا، کرگسوں میں پلے ہوئے شاہینوں کو ان کا مقام یاد دلایا، اس طرح عہد جدید کے مختلف طبقات پر اس ایک شخص نے جتنے گہرے اثرات ڈالے، اس کی کوئی مثال ان کے معاصرین میں نہیں ملتی، اور اسلامک فقہ اکیڈمی نے بہت قلیل مدت میں مسلمانوں کے علمی حلقوں میں جو شعور وآگہی پیدا کی اور ان

کو مطالعہ اور تحقیق کا جیسا عادی بنایا، اس ہمہ گیر سطح پر موجودہ ہندوستان کا کوئی ادارہ اس کی ہمسری نہیں کر سکتا (ہماری مرکزی درسگاہوں کا استثنا کر کے کہ ان کا موضوع الگ ہے)

قاضی صاحب سراپا تحریک اور مجسم انقلاب تھے، انہوں نے خالق فطرت کی جناب سے جو بے قرار طبیعت پائی تھی، وہ ان کو ہر وقت کسی نہ کسی کام، کارنامے اور تحریک کے لئے بے چین رکھتی تھی، ملک وملت کے مسائل ان کو ایک پل کے لئے آرام نہ دیتے تھے، ملک وبیرون ملک ان کی مخالفتیں بھی ہوئیں، ان کے خلاف افواہوں کی گرم بازاری بھی رہی، پمفلٹ اور کتابچے بھی شائع ہوئے، لیکن اس مرد آہن کے پائے استقامت میں تزلزل نہ آیا، وہ اپنی جگہ کھڑا قوم وملت میں انقلاب وشعور کا صور پھونکتا رہا، بلکہ اس نے آگے بڑھ کر اپنے مخالفوں کو بھی سینے سے لگایا، محبت ودرد کے ساتھ ان پر اپنا موقف واضح کیا، اور ان کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوششیں کیں، اور اس نے زبان حال سے یہ ثابت کیا:

اے وقت مجھ کو کھوکھلی دیوار مت سمجھ
صدیوں سے زلزلوں کے مقابل رہا ہوں میں

قاضی صاحب کی ہمہ گیر اثر انگیزی

اگر کوئی شخص پورے ہندوستان کا باریکی سے جائزہ لے، بالخصوص علمی حلقوں کی مجلسوں کا احاطہ کرے، تو وہ ان سب پر واضح طور پر قاضی صاحب کی محنتوں کے اثرات محسوس کرے گا۔۔۔ یہ بیداری، یہ شعور وآگہی یہ جذبۂ تحقیق، یہ ذوق جستجو، یہ کتابوں سے عشق، یہ مخطوطات اور نایاب مجموعوں کی تلاش، یہ تبادلۂ افکار کا انداز، یہ لب ولہجہ کی سنجیدگی، اور یہ باوقار علمی وفقہی مجلسیں یہ سب کے سب بالواسطہ یا بلا واسطہ اور براہ راست عمل کے نتیجے میں یا ردعمل کے نتیجے میں اسی مرد انقلاب سے مربوط نظر آئیں گے۔

میں نے دیوبند میں ایک سے زائد بار دیکھا کہ اکیڈمی کے فقہی سمینار سے قبل یا بعد قاضی صاحب دیوبند تشریف لائے، یہاں کے اساتذہ، مفتیان اور ذمہ داروں سے ملاقاتیں کیں اور بڑے درد سے ان سے کہا کہ:

"یہ آپ کے کرنے کا کام ہے یہ آپ کا بوجھ ہے، جس کو میرا دوش ناتواں ڈھو رہا ہے ، اٹھئے اور یہ کام کیجئے ، یہ عظیم الشان کام دار العلوم دیوبند نہیں کرے گا تو کون کرے گا، میں بھی اسی مادر علمی کا ایک فرزند ہوں ، میں اپنے بزرگوں اور دوستوں سے گزارش کرتا ہوں کہ اٹھیں اور اس کو سنبھالیں (مفہوم)

چنانچہ کچھ دنوں کے بعد دیکھا گیا کہ "ادارۃ المباحث الفقہیۃ" کا احیاء عمل میں آیا، اور دلی ،دیوبند اور مدراس میں اس ادارہ کے تحت کئی فقہی اجتماعات منعقد ہوئے، جس کے ایک ادنی فرد کی حیثیت سے اس حقیر نے بھی شرکت کی۔

یہ آنکھ کس کی آواز پہ کھلی ؟ یہ ہمت وبیداری کس نے دی؟اور دیوبند ، دلی اور سارے ہندوستان کو کس نے جگایا؟۔۔۔ان سوالات کے جواب میں سوائے حضرت قاضی صاحبؒ اور کس کا نام لیا جائے گا؟ایک شاعر کے شعر سے استفادہ کرتے ہوئے:

بہار اب جو گلشن میں آئی ہوئی
یہ سب پود اسی کی لگائی ہوئی ہے

قاضی صاحب کے لئے بعض اکابر علماء کے اعترافات

مجھے یاد ہے کہ "اسلامک فقہ اکیڈمی" کے دوسرے سمینار میں پاکستان کے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ نے صدارتی خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"ہندوستان میں اسلامک فقہ اکیڈمی کا قیام نہ صرف ان ممالک کے لئے ایک قابل تقلید قدم ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ، بلکہ یہ ادارہ اسلامی ممالک اور خود پاکستان کے لئے بھی انشاء اللہ مشعل راہ ہو گا"[26]

---

[26] – مجلہ فقہ اسلامی ج ۲ ص ۵۲۲

حیدر آباد کے چوتھے فقہی سمینار سے خطاب کرتے ہوئے عالم اسلام کے مشہور فقیہ و محقق حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ نے اپنے صدارتی خطاب میں ارشاد فرمایا:

"مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ اور ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالی نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے، آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم و فضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے[27]

مجھے پٹنہ سمینار میں حضرت مولانا محمد سالم القاسمیؒ (سابق صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند) کی وہ صدارتی تقریر بھی خوب یاد ہے، جس میں ایک جانب حضرت قاضی صاحبؒ تشریف فرما تھے، اور دوسری جانب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم رونق افروز تھے، حضرت مولانا محمد سالم صاحبؒ نے خالص علمی انداز میں ایک مبسوط تقریر فرمائی، اور علماء کے اس منتخب مجمع کو خانوادۂ قاسمی کے اس چشم و چراغ نے جس علمی اور استدلالی انداز میں درس دیا، وہ انہی کا حق تھا، وہ قاسم العلوم کے پڑپوتے تھے، انہی سے یہ امید رکھی جاسکتی تھی کہ وہ اتنی حقیقت پسندی کے ساتھ اکیڈمی اور قاضی صاحبؒ کی خدمات کو محسوس کریں گے اور اس کا بے تکلف اظہار فرمائیں گے، ورنہ عام طور پر معاملہ ہوتا ہے کہ "دل مانتا ہے مگر زبان نہیں بول سکتی"۔ حضرت مولانا محمد سالم صاحبؒ نے فرمایا کہ:

کچھ لوگ تصوف کی اصطلاح میں ابو الحال ہوتے ہیں، اور کچھ ابن الحال، کچھ لوگوں پر فن حاوی ہوتے ہیں، اور کچھ فن پر حاوی ہوتے ہیں، مثلاً صحاح ستہ کے مصنفین میں حضرت امام ترمذیؒ، نسائیؒ، ابو داؤدؒ اور ابن ماجہؒ، ابن الحال ہیں یعنی فن حدیث ان پر حاوی ہے، جب کہ حضرت امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ ابو الحال ہیں، یعنی یہ

---

[27] – مجلہ فقہ اسلامی ج ۴ ص ۳۵

حضرات خود فن پر حاوی ہیں، ہمارے اس دور میں بر صغیر کی شخصیات میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور حضرت مولانا تقی عثمانی ابو الحال ہیں، یہ حضرات فن فقہ پر حاوی ہیں، فن ان پر حاوی نہیں ہے الخ۔۔۔۔

غرض عام طور پر عالم اسلام کے علماء اور اکابر نے قاضی صاحبؒ کے اس انقلابی کارنامے کو سراہا اور ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام کی بیداری کا باعث قرار دیا۔

اس طرح نہ معلوم اکیڈمی اور اس کے سیمیناروں سے نہ معلوم میری کتنی یادیں وابستہ ہیں، سب کو لکھوں تو ایک کتاب بن جائے، میں نے بعض سمیناروں کے تأثرات ومشاہدات اسی وقت لکھ دیئے تھے، جو مختلف رسائل وجرائد اور اخبارات میں شائع ہوئے، وہ میرے تازہ ترین احساسات تھے، جن میں زندگی اور تازگی تھی، آج تو جو کچھ لکھ رہا ہوں اس میں غم ہے، کرب ہے، اداسی اور مایوسی ہے، اور ساری یادیں پرانی ہو چکی ہیں، اور ان یادوں کا سرچشمہ میرا مربی ومحسن بھی اس دنیا سے جاچکا ہے، اب کون میری تحریروں کی قدر کرے گا، اور میرے طول طویل مقالات کو بھی پوری محبت اور توجہ سے پڑھے گا، اب میں علمی طور پر خود کو یتیم محسوس کرتا ہوں، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے، اجالوں کا منتظر ہوں، مگر کوئی کرن نظر نہیں آتی، قاضی صاحب کی بس ایک یاد جو دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے سمینار سے وابستہ ہے، اس سے کچھ حوصلہ ملتا ہے، لکھتا ہوں تاکہ میری طرح کچھ اور لوگوں کو بھی تقویت ملے، قاضی صاحبؒ نے اس سمینار میں بڑا درد سے لبریز اور اثر انگیز خطاب فرمایا تھا، ان کے یہ الفاظ آج تک گویا میری سماعت سے ٹکرا رہے ہیں کہ:

"عزیزو اور دوستو! افراد آتے اور جاتے رہیں گے، افراد پر کسی ادارہ وتحریک کا کام موقوف نہیں رہتا، یہ خدا کا کام ہے، خدا زندہ ہے تو یہ کام بھی زندہ رہنا چاہیے، آپ نے جس خون جگر کی آمیزش سے فقہ وقانون کی یہ تحریک شروع کی ہے، اس کو میرے بعد بھی جاری رکھئے، کسی فرد پر کام موقوف نہ رکھئے، یہ بڑا کام ہے جو آپ حضرات کر رہے ہیں، میری خواہش ہے کہ میرے رفقاء اور احباب اس کام کو جاری

رکھیں، پرانے لوگ جاتے رہیں گے اور نئے لوگ شامل ہوتے رہیں گے، اور یہ کارواں ہمہ دم رواں دواں رہے گا، ان شاء اللہ، اللھم آمین"

پتہ نہیں اس تقریر کی کیسٹ دار العلوم اسلامیہ بستی کے ریکارڈ میں ہے یا نہیں، کاش اس موقعہ کی قاضی صاحب کی پوری تقریر شائع ہو جاتی، یہ ان کا کلمۃ الوداع تھا، اللہ حضرت قاضی صاحبؒ کی اس تحریک کو جاری رکھے اور ان کے علمی فیوض کا یہ سلسلہ قائم و دائم رکھے، اور ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

قاضی صاحب نے اس سلسلے میں طلبہ اور جدید فضلاء کے لئے جو تربیتی مراکز مختلف علاقوں میں مختلف مواقع پر قائم فرمائے وہ بھی اسی سلسلہ کا تعمیری اقدام تھا۔

قاضی صاحب نے علمی صحافت کا معیار بلند کیا

بلاشبہ قاضی صاحب ایک تحریکی اور انقلابی شخصیت کے مالک تھے، انہوں نے علم و فن کے مختلف مرحلوں میں بیداریاں پیدا کیں، مجھے خوب یاد ہے اور بہتوں کو یاد ہو گا کہ رسالہ "بحث و نظر" سے قبل اس معیار یا انداز کا کوئی علمی رسالہ ہندوستان بلکہ پورے حلقۂ اردو ہی میں موجود نہیں تھا (الا ماشاء اللہ) اسی لئے جس وقت اس کے اجراء کی خبر ملی تھی بہت سے لوگوں کو حیرت ہوئی تھی کہ بد ذوقی، اردو بیزاری، اور علم و فن کے انحطاط کے اس دور میں اس قسم کا رسالہ کون پڑھے گا؟۔۔۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اخلاص میں بڑی قوت ہوتی ہے، قاضی صاحبؒ کا یہ رسالہ نہ صرف یہ کہ مقبول عام و خاص ہوا، ہزاروں لوگ اس کے خریدار بنے، بلکہ اس رسالہ نے ہندستان کی بنجر زمینوں کو لالہ زار کر دیا، علمی حلقوں میں ایسے رسالے پڑھنے کی صلاحیت اور پیاس پیدا کی، اور تحریر و صحافت کا ایک نیا معیار قائم کیا جو علم، تعمق، سنجیدگی اور پاکیزگی سے عبارت تھا، چنانچہ "بحث و نظر" کے بعد ملک کے کئی خطوں اور علمی حلقوں میں آہستہ آہستہ اس طرف پیش رفت ہوئی، کئی علمی رسائل کا آغاز ہوا اور انہوں نے ملک میں اپنی جگہ اور طلب پیدا کی۔

اس طرح قاضی صاحب نے صحافت کے میدان میں بھی ایک انقلابی کارنامہ انجام دیا، لوگوں کے ذوق مطالعہ کا معیار بلند کیا، سستے اور سطحی ادب کے ذوق سے اٹھا کر ان کو بیش قیمت اور بلند علمی ادب

کے ذوق سے آشنا کیا،۔۔۔ آج کوئی نام لے یا نہ لے لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اچھے معیاری، علمی رسائل کی اشاعت اور ان کے لئے باذوق قارئین کی فراہمی کا جو ماحول آج ہندوستان میں نظر آرہا ہے وہ زیادہ تر اسی رسالہ "بحث و نظر" کا رہین منت ہے۔

صنعتی انقلاب کی طرف توجہ

قاضی صاحب نے جدید ٹیکنالوجی کے میدان میں بھی جو کارنامہ انجام دیا وہ بھی کم انقلاب انگیز ثابت نہیں ہوا، عام طور پر مسلمان بالخصوص علماء جدید ترقیات اور ٹیکنالوجی سے دور ہوتے جارہے تھے وہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارا کام نہیں یا ہم اس کے لائق نہیں ہیں، مسلمانوں کا بڑا طبقہ باوجود تمام تر ذہانت اور علمی لیاقت کے بے روزگار تھا، قاضی صاحب نے مختلف علاقوں میں مختلف صنعتی مراکز قائم کئے اور مسلم طلبہ کو ان سے استفادہ پر آمادہ کیا۔۔۔ قاضی صاحب کی ان مساعی جمیلہ سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مستفید ہوا اور ان میں جدید ٹکنالوجی کا شعور بیدار کیا۔

تحقیقی ذوق کی نشو و نما

قاضی صاحب نے کئی اہم مخطوطات اور نادر کتابوں کی تحقیق و تعلیق اور بہت سے وہ علمی قانونی مجموعے جو عالم عرب میں تیار ہوئے تھے ان کے اردو تراجم کی طرف توجہ دی اور اسلامک فقہ اکیڈمی سے ان کو شائع کرایا، اور فضلاء کی ایک ٹیم اس کی جانب متوجہ کردی، اس طرح عام علماء کو قانون اور فقہ اسلامی کے بہت سے اہم گوشوں سے واقفیت ہوئی، یہ قاضی صاحب کی انقلابی شخصیت کا اہم ترین حصہ ہے

عبقری شخصیت

قاضی صاحب کے قریب جو لوگ رہتے تھے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ منصوبہ ساز ذہن و دماغ کے مالک تھے، ہر وقت ان کا دماغ کسی نہ کسی علمی اور تعمیری منصوبے تیار کرنے میں مشغول رہتا تھا، قاضی صاحب کے پاس بہت زیادہ وسائل نہیں تھے، اور نہ ان کو عمر عزیز نے بہت زیادہ مواقع دیئے، ورنہ بڑے بڑے کام تھے ان کے ذہن میں، کاش ان کاموں کا مفصل خاکہ ہی سامنے آگیا ہوتا، تو آئندہ نسلوں

کے لئے مشعل راہ ہوتا، بڑا عبقری دماغ تھا ان کا، یوں تو برصغیر میں مختلف علوم وفنون کے بہت سے ماہرین اور ممتاز شخصیتیں موجود ہیں جن کے ناموں اور کاموں کی عظمت سے دل مرعوب اور متأثر ہیں، مگر قاضی صاحب کی شخصیت ان سب میں ممتاز تھی، ان کے سامنے بڑی بڑی شخصیتیں اس طرح گم ہو جاتی تھی جیسے چراغ سورج کی روشنی میں گم ہو جاتا ہے، یا چھوٹی نہریں بڑی دریا میں ضم ہو جاتی ہیں۔

میں اپنے دور کے علماء میں بہت سے علماء سے متأثر ہوا، لیکن علم وفضل، فقہ وقانون، اور تعمیر وتشکیل کے حوالے سے جتنا قاضی صاحب سے متأثر ہوا کسی سے نہیں ہوا۔

فقیہ النفس عالم دین

اس ہندوستان میں بڑی بڑی اہل فن اور اہل کمال شخصیتیں اور ممتاز علماء فقہاء موجود ہیں مگر موضوع اور مسئلے کا تجزیہ وتحلیل، اس کی گہرائی تک رسائی، اس کی نزاکتوں کا ادراک اور بہت آسانی کے ساتھ کسی مسئلے کو حل کرنے کا جو فن اللہ تعالیٰ نے قاضی صاحب کو دیا تھا، اس کی مثال اس دور میں نہیں ملتی، میرا بارہا کا تجربہ ہے کہ کئی دقیق مسائل جو دیگر علماء کی گھنٹوں کی بحث وتحقیق سے بھی حل نہیں ہو سکے تھے، قاضی صاحب نے منٹوں میں حل کر دیئے جس کو چٹکیوں میں حل کرنا کہہ سکتے ہیں۔۔۔۔ یہ وہ عجیب وغریب خصوصیت تھی جو اس دور میں بالکل عنقا ہے، کتابوں میں اکابر علماء اور قدیم محققین کے اس نوعیت کے بڑے واقعات پڑھے ہیں، مگر عملی زندگی میں واقعاتی طور پر مجھے اس چیز کا سب سے زیادہ مشاہدہ قاضی صاحبؒ کے یہاں ہوا۔

میں نے محسوس کیا کہ فقہ اور قانون اسلامی ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی، جو بقول حضرت مولانا محمد سالم قاسمی رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر مہتمم دار العلوم دیوبند (وقف) بحیثیت فن ان پر حاوی نہیں تھا، بلکہ خود حضرت قاضی صاحبؒ اس پر حاوی تھے، (پٹنہ سمینار) ان کے فقہی ملکہ کے پیش نظر میرا اپنا احساس علامہ کشمیریؒ کی اصطلاح میں یہ ہے کہ قاضی صاحبؒ ہمارے دور کے "فقیہ النفس" عالم دین تھے، فقہ ان کے ذوق ومزاج میں اس طرح رچ بس گئی تھی، جیسے خوشبو پھول کی پتیوں میں رچی بسی ہوتی ہے،

قانون اسلامی بلکہ بین الاقوامی قوانین کی نزاکتوں کے بارے میں وہ جس بصیرت کے حامل تھے کہ شاید باید۔

میر کارواں چلا گیا

قاضی صاحب کی خطابت بھی بڑی سحر انگیز اور انقلاب آفریں تھی، آواز وانداز میں وہ بلا کی قوت وتاثیر اور بر محل گفتگو کا وہ سلیقہ وشعور انہوں نے پایا تھا کہ جہاں پہونچے امامت وسالاری نے ان کا استقبال کیا، جس مجلس میں گئے صدر مجلس بنائے گئے اور جس کارواں میں شامل ہوئے "میر کارواں" کی حیثیت سے رہے۔

قاضی صاحب جہاں گئے، جس ادارہ کے ساتھ رابطہ رکھا اس کو فعال اور متحرک بنادیا، امارت شرعیہ کا دار القضاء ہو، اس کا شعبہ تربیت قضاء وافتاء ہو یا اس کا بیت المال، اسلامک فقہ اکیڈمی ہو یا آل انڈیا ملی کونسل، مسلم پرسنل لا بورڈ ہو یا شعبۂ تحقیق وتصنیف، قاضی صاحب کے قدم جہاں جہاں پڑے خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور کارکردگی اور افادیت میں اضافہ ہوا۔

آج وہ ہم میں نہیں ہیں تو ان کی کتنی کمی محسوس ہو رہی ہے، ہندوستان ممتاز علماء وفقہاء اور بڑی بڑی ہستیوں سے بھرا ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود قاضی صاحب کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی ہے، اور بہت دنوں تک کی جاتی رہے گی،۔۔۔ اب کوئی شخصیت ایسی نہیں جو ہمہ گیر اور جامع الکمالات ہو، کوئی دکان ایسی نہیں جہاں علم وفن کے ہر درد کی دوا مل سکتی ہو، کوئی مسند علم ایسی نہیں جہاں ہر مشکل کا حل اور ہر بے قراری کے لئے قرار موجود ہو، علامہ انور صابریؒ کے الفاظ میں۔۔ جو انہوں نے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ کے وصال پر ان کی روح پر فتوح کو مخاطب کر کے کہے تھے (قدرے ترمیم کے ساتھ آپ ہی کے تلمیذ رشید کے لئے)

سکون زندگانی کی دوا پانے کہاں جائے
جگر کے زخم دل کے داغ دکھلانے کہاں جائیں
ترے گیسوئے ہستی سے جنوں کو جن کے نسبت تھی

بتا اے قائد ملت وہ دیوانے کہاں جائیں

پہلے ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے تھے، اب شاید صدیوں میں بھی پیدا نہ ہونگے، موت برحق ہے، ان کے چلے جانے سے دنیا کا کوئی نظام درہم برہم نہیں ہوگا، سب کچھ اسی طرح چلتا رہے گا، انجمنیں بھی قائم رہیں گی، میکدے بھی آباد رہیں گے، ساغر ومینا کا دور بھی چلتا رہے گا، اور جام وپیمانے کی گردشیں بھی جاری رہیں گی۔۔ لیکن۔۔۔ سب کچھ۔۔۔ اداس، اداس۔۔۔۔

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے[28]

---

[28] – تحریر بہ مقام دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد، بتاریخ ۳/ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ مطابق ۱۷/ اپریل ۲۰۰۲ء